

سرمايۂ اُردو

11



پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

سرمایہ اُردو

(اُردو لازمی)

گیارھویں جماعت کے لیے



پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ، لاہور

جملہ حقوق بحق پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور محفوظ ہیں۔
 تیار کردہ: پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور
 منظور کردہ: قومی ریویو کمیٹی، وفاقی وزارت تعلیم (شعبہ نصاب سازی) حکومت پاکستان، اسلام آباد۔

اس کتاب کا کوئی حصہ نقل یا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اسے ٹیسٹ پیپر، گائیڈ بکس،
 خلاصہ جات، نوٹس یا امدادی کتب کی تیاری میں استعمال کیا جاسکتا ہے۔

مؤلفین

- محمد زمیر سہابی
- پروفیسر ایاز اصغر شاہین
- ڈاکٹر محمد خان اشرف

مدیران

- پروفیسر افتخار الدین سہیل
- پروفیسر حفیظ صدیقی

نگران

- ڈاکٹر محمد سہیل سرور
- سرفراز احمد فتیانہ

مطبع: الرحیم آرٹ پریس لاہور

ناشر: پی ٹی بی ایچ پبلائزنگ پریس سوسائٹی لاہور

تاریخ اشاعت	ایڈیشن	طباعت	تعداد اشاعت	قیمت
مئی 2012ء	1	18	30,000	49.00

فہرست

مصنفین / شعرا

صفحہ

عنوانات

نمبر شمار

حصہ نثر

1	سید سلیمان ندویؒ	اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	1
6	سر سید احمد خاں	اپنی مدد آپ	2
10	مولانا الطاف حسین حالی	سر سید کے اخلاق و خصائل	3
16	حمید عسکری	ابوالقاسم زہراوی	4
20	پریم چند	ادیب کی عزت	5
28	غلام عباس	اوور کوٹ	6
35	احمد ندیم قاسمی	سفارش	7
40	ہاجرہ مسرور	چراغ کی لو	8
45	مرزا اسد اللہ خاں غالب	مکتوبات غالب	9
48	علامہ محمد اقبالؒ	مکتوبات اقبالؒ	10
51	پروفیسر احمد شاہ بخاری پطرس	لاہور کا جغرافیہ	11
57	شفیع عقیل	دوستی کا پھل	12
64	ابن انشا	کیا واقعی دنیا گول ہے؟	13
67	مشتاق احمد یوسفی	اور آنا گھر میں مرغیوں کا	14

حصہ نظم

73	(امیر احمد) امیریتائی	حمد	1
74	ماہر القادری	نعت	2
76	نظیر اکبر آبادی	تسلیم و رضا	3
78	میر انیس	میدان کر بلا میں صبح کا منظر	4

80	مولانا ظفر علی خاں	مستقبل کی جھلک	5
82	اختر شیرانی	برسات	6
84	حقیقہ جالندھری	ہلال استقلال	7
86	علامہ محمد اقبالؒ	خطاب بہ جوانان اسلام	8
87	علامہ محمد اقبالؒ	پیغام	9
89	سید محمد جعفری	ایپسٹریکٹ آرٹ	10
91	مرزا محمود سرحدی	قطعات	11
93	دلاور فگار	لوکل بس	12
95	مست توکلی (ترجمہ طارق قریشی)	وجدانیت	13

حصہ غزل

97	میر تقی میر	1 جس سر کو غرور آج ہے ، یاں تاج وری کا
99	میر تقی میر	گل کو ہوتا صبا ! قرار اے کاش !
101	حیدر علی آتش	2 ہوئے دور مئے خوش گوار ، راہ میں ہے
103	حیدر علی آتش	یہ آرزو تھی ، تجھے گل کے روبرو کرتے
105	میرزا خاں داغ	3 پھرے راہ سے وہ ، یہاں آتے آتے
107	میرزا خاں داغ	خاطر سے یا لحاظ سے ، میں مان تو گیا
109	مومن خاں مومن	4 اثر اس کو ، ذرا نہیں ہوتا
111	مومن خاں مومن	ٹھانی تھی دل میں ، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
113	حسرت موہانی	5 بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
115	حسرت موہانی	رسم جفا کامیاب ، دیکھیے کب تک رہے
117	فیض احمد فیض	6 نہ گنواؤ ناوک نیم کش ، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
119	فیض احمد فیض	کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں ، کب بات میں تیرا بات نہیں
121	احمد ندیم قاسمی	7 کچھ غلط بھی تو نہیں تھا ، مرا تنہا ہونا
123	احمد ندیم قاسمی	اب تو کچھ اور ہی ، اعجاز دکھایا جائے

فرہنگ

اُسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خدا کی محبت کا اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کے لیے ہر مذہب نے ایک ہی تدبیر بتائی ہے اور وہ یہ ہے کہ اس مذہب کے شارع اور طریقے کے بانی نے جو عمدہ نصیحتیں کی ہیں، ان پر عمل کیا جائے، لیکن اسلام نے اس سے بہتر تدبیر اختیار کی ہے۔ اس نے اپنے پیغمبرؐ کا عملی مجسمہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے اور عملی مجسمے کی پیروی اور اتباع کو خدا کی محبت کا اہل اور اس کے پیار کا مستحق بننے کا ذریعہ بتایا ہے۔ چنانچہ اسلام میں دو چیزیں ہیں، کتاب اور سنت۔ کتاب سے مراد خدا کے احکام ہیں جو قرآن مجید کے ذریعے سے ہم تک پہنچے ہیں اور سنت جس کے لغوی معنی راستے کے ہیں، وہ راستہ کہ جس پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدا کے احکام پر عمل کرتے ہوئے گزرے یعنی آپؐ کا عملی نمونہ جس کی تصاویر احادیث میں بہ صورت الفاظ درج ہیں۔ غرض یہ کہ ایک مسلمان کی کامیابی اور تکمیل روحانی کے لیے جو چیز ہے وہ سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔

وہ تمام اشخاص جو کسی مذہب کے حلقہ اطاعت میں داخل ہوں ناممکن ہے کہ وہ کسی ایک ہی مذہب انسانی سے تعلق رکھتے ہوں۔ اس دنیا کی بنیاد اختلاف عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے سے یہ دنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیس، جمہور اور حکام بھی ضروری ہیں اور محکوم، مطیع اور فرماں بردار رعایا بھی، امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی، غریب بھی ہیں اور دولت مند بھی، رات کے زہد و عابد بھی ہیں اور دن کے سپاہی و مجاہد بھی، اہل و عیال بھی ہیں اور دوست احباب بھی، تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام اور پیشوا بھی۔ غرض اس دنیا کا نظم و نسق مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمے اور نمونے کی ضرورت ہے۔ اسلام ان تمام انسانوں کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتباع کی دعوت دیتا ہے۔

انسانوں کے ہر طبقے اور صنف کے لیے سیرت پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے درس اور سبق موجود ہے۔ ایک حاکم کے لیے محکوم کی زندگی، ایک دولت مند کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے دولت مند کی زندگی کا مل مثال اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ اس لیے ضرورت ہے کہ عالم گیر اور دائمی پیغمبرؐ کی زندگی ان تمام مختلف مناظر کے رنگ برنگ پھولوں کا گلہ سہ ہو۔ ہم چلتے پھرتے بھی ہیں، اٹھتے بیٹھتے بھی، کھاتے پیتے بھی ہیں، سوتے جاگتے بھی، ہنستے بھی ہیں روتے بھی، پہنتے بھی ہیں اتارتے بھی، سیکھتے بھی ہیں سکھاتے بھی، مرتے بھی ہیں مارتے بھی، کھاتے بھی ہیں اور کھلاتے بھی، احسان لیتے بھی ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ اپنی جان دیتے بھی ہیں اور بچاتے بھی، عبادت و دعا بھی کرتے ہیں اور کاروبار بھی، مہمان بھی بنتے ہیں اور میزبان بھی۔ ہمیں ان تمام امور، جو ہمارے مختلف افعال جسمانی سے تعلق رکھتے ہیں، کے لیے عملی نمونے کی ضرورت ہے جو ہر نئی حالت کے پیش آنے میں ایک نئی ہدایت کا سبق اور نئی رہنمائی کا درس دے۔

علاوہ ازیں وہ افعال جن کا تعلق دل و دماغ سے ہے اور جن کی تعبیر ہم اعمالِ قلب یا جذبات اور احساسات سے کرتے ہیں۔ ہر آن ہم ایک نئے قلبی عمل، جذبے یا احساس سے متاثر ہوتے ہیں۔ ہم کبھی راضی ہیں، کبھی ناراض کبھی خوش ہیں کبھی غم زدہ، کبھی مصائب سے دوچار ہیں اور کبھی نعمتوں سے مالا مال، کبھی ناکام ہوتے ہیں اور کبھی کامیاب، ان سب حالتوں میں ہم مختلف جذبات کے ماتحت ہوتے ہیں۔ اخلاقی فاضل کا تمام تر انحصار انھی جذبات اور احساسات کے اعتدال اور باقاعدگی پر ہے، ان سب کے لیے ہم کو ایک عملی سیرت کی حاجت ہے۔

عزم و استقلال، شجاعت، صبر، شکر، توکل، رضا، تقدیر، مصیبتوں کی برداشت، قربانی، قناعت، استغنا، ایثار، جود، تواضع، خاکساری، مسکنت، نشیب و فراز، بلند و پست، تمام اخلاقی پہلوؤں کے لیے جو مختلف انسانوں کو مختلف حالتوں میں یا ہر انسان کو مختلف صورتوں میں پیش آتے ہیں، ہمیں عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے جو صرف پیغمبر اسلام کی سوانح میں مل سکتی ہیں۔

غرض ایک ایسی شخصی زندگی جو ہر طاقتور انسانی اور ہر حالت انسانی کے مختلف مظاہر اور ہر قسم کے صحیح جذبات اور کامل اخلاق کا مجموعہ ہو، صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت ہے۔ اگر دولت مند ہو تو مکے کے تاجر اور خزین کے خزانہ دار کی تقلید کرو۔ اگر غریب ہو تو شعب ابی طالب میں محصور اور مدینے کے مہمان کی کیفیت سنو۔ اگر بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو۔ اگر رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو۔ اگر فاتح ہو تو بدر و جنین کے سپہ سالار پر نگاہ دوڑاؤ۔ اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکہ احد سے عبرت حاصل کرو۔ اگر تم استاد اور معلم ہو تو صفحہ کی درس گاہ کے معلمِ قدس کو دیکھو۔ اگر شاگرد ہو تو روح الامین کے سامنے بیٹھنے والے پر نظر جماد۔ اگر واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو۔ اگر تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکے کے بے یار و مددگار نبی کا اسوہ حسنہ تمہارے سامنے ہے۔ اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کم زور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو۔ اگر اپنے کاروبار اور دنیاوی جدوجہد کا نظم و نسق درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر، خیبر اور فدک کی زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم و نسق کو دیکھو۔ اگر سفری کاروبار میں ہو تو بصرہ کے کارواں سالار کی مثالیں ڈھونڈو۔ اگر عدالت کے قاضی اور پچائیت کے ثالث ہو تو کعبے میں نور آفتاب سے پہلے داخل ہونے والے ثالث کو دیکھو جو حجر اسود کو کعبے کے ایک کونے میں نصب کر رہا ہے۔ مدینے کی چکی مسجد کے صحن میں بیٹھنے والے منصف کو دیکھو جس کی نظر انصاف میں شاہ و گدا اور امیر و غریب برابر تھے۔ اگر تم بیویوں کے شوہر ہو تو خدیجہ عاتشہ کے شوہر کی حیات پاک کا مطالعہ کرو، اگر اولاد والے ہو تو فاطمہؓ کے سب اور حسن و حسینؓ کے نانا کا حال پوچھو۔ غرض تم جو کوئی بھی ہو اور کسی حال میں بھی ہو تمہاری زندگی کے لیے نمونہ، تمہاری سیرت کی درستی و اصلاح کے لیے سامان، تمہارے ظلمتِ خانہ کے لیے ہدایت کا چراغ اور رہنمائی کا نور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔ اس لیے طبع انسانی کے ہر طالب علم اور نور ایمانی کے ہر متلاشی کے لیے صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت، ہدایت کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے۔

ایسی کامل و جامع ہستی جو اپنی زندگی میں ہر نوع اور ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنف انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو، وہی اس لائق ہے جو اس اَصناف و انواع سے بھری ہوئی دنیا کی عالم گیر اور دائمی رہنمائی کا کام سرانجام دے، جو غیظ و غضب اور رحم و کرم،

جو دوستِ وفا، شجاعت و بہادری اور رحم دلی، رقیق القلبی، دنیا اور دین دونوں کے لیے ہمیں اپنی زندگی کے نمونوں سے بہرہ مند کر دے، جو دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی اور اس آسمان کی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دے اور دونوں بادشاہیوں کے قواعد و قوانین اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں برت کر دکھا دے۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مبارک ایک آفتابِ عالم تاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت، اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کرتے تھے یا ابر باراں تھا، جو پہاڑ اور جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا، قسم قسم کے درخت اور رنگ پھول اور پتے جم رہے تھے اور آگ رہے تھے۔

بادشاہ ہو یا گدا، امیر ہو یا غریب، حاکم ہو یا محکوم، قاضی ہو یا گواہ، افسر ہو یا سپاہی، استاد ہو یا شاگرد، عابد و زاہد ہو یا کاروباری، غازی ہو یا شہید، توحید کا نور، اخلاص کی رو، قربانی کا ولولہ، خلق کی ہدایت اور راہنمائی کا جذبہ اور پالا آخر ہر کام میں خدا کی رضا طلبی کا جوش ہر ایک کے اندر کام کر رہا تھا۔ وہ جو کچھ بھی ہو، جہاں بھی ہو، یہ فیضانِ حق سب میں یکساں اور برابر تھا۔ راستوں، رنگوں اور مذاقوں کا اختلاف تھا مگر خدا ایک تھا، قرآن ایک تھا، رسول ایک تھا اور قبلہ ایک تھا۔ ہر رنگ، ہر راستہ اور ہر کام سے مقصود دنیا کی درستی، خلق کی ہمدردی، خدا کے نام کی اونچائی اور حق کی ترقی تھی اور ان کے سوا کوئی چیز ان کے پیش نظر نہ تھی۔

یہ دنیا انسانی مزاجوں اور انسانی صلاحیتوں اور استعدادوں کے اختلاف کا نام ہے تو یقین کرو کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جامع شخصیت کے سوا اس کا کوئی آخری اور دائمی گیرا ہنما نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اعلان فرمایا کہ:

”اگر تمہیں خدا کی محبت کا دعویٰ ہے، تو آؤ میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت کرے گا۔“

(خطباتِ مدراس)

مشق

- 1- سبق ”اُسوۂ حسنہ“ کی روشنی میں مندرجہ ذیل جملے مکمل کریں:
- i- اسلام میں دو چیزیں ہیں، کتاب اور.....
- ii- مسلمان کی کامیابی اور تکمیل روحانی کے لیے جو چیز ہے وہ..... ہے۔
- iii- اس دُنیا کی بنیاد..... عمل پر ہے۔
- iv- اسلام تمام انسانوں کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے..... کی دعوت دیتا ہے۔
- v- ہمیں عملی ہدایت اور مثال کی ضرورت ہے جو صرف..... کی سوانح میں مل سکتی ہے۔
- vi- ہدایت کا چراغ اور راہنمائی کا نور..... کی جامعیت کبریٰ کے خزانے میں ہر وقت اور ہمہ دم مل سکتا ہے۔
- vii- محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مبارک ایک آفتاب..... تھا۔
- viii- یہ فیضانِ حق سب میں..... اور برابر تھا۔

2- سبق ”اسوۂ حسنہ“ کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) لگائیں۔

i- خدا کی محبت کا اہل اور اُس کے پیار کا مستحق بننے کے لیے اسلام نے:

- ا۔ احکام الہی سب کے سامنے رکھ دیے ہیں۔
 ب۔ انبیاء کی حیات سب کے سامنے رکھ دی ہے۔
 ج۔ اپنے پیغمبر کا عملی مجسمہ سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔
 د۔ خلفائے راشدین کا اسوۂ سب کے سامنے رکھ دیا ہے۔

ii- ایک مسلمان کی کامیابی اور تکمیل روحانی کے لیے جو چیز ہے:

- ا۔ وہ سنت نبویؐ ہے
 ب۔ وہ اسوۂ اسلاف ہے
 ج۔ وہ اسوۂ صحابہؓ ہے
 د۔ وہ اسوۂ انبیاءؑ ہے

iii- اس دنیا کی بنیاد ہے:

- ا۔ اختلاف عمل پر
 ب۔ تعاون عمل پر
 ج۔ اجتماعی عمل پر
 د۔ ذاتی عمل پر

iv- مکہ کے تاجراور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کروا کر:

- ا۔ غریب ہو تو
 ب۔ دولت مند ہو تو
 ج۔ جوان ہو تو
 د۔ سفری کاروبار میں ہو تو

v- فاتح مکہ کا نظارہ کروا کر تم:

- ا۔ دشمنوں اور مخالفوں کو شکست دے چکے ہو۔
 ب۔ دشمنوں اور مخالفوں کو کم زور بنا چکے ہو۔
 ج۔ دشمنوں اور مخالفوں کو مطیع بنا چکے ہو۔
 د۔ دشمنوں کو زیر اور مخالفوں کو کم زور بنا چکے ہو۔

3- سبق اسوۂ حسنہ کو مد نظر رکھ کر کالم الف کے اندراج کا ربط کالم ب سے قائم کریں اور جواب کالم ج میں لکھیں:

کالم الف	کالم ب	کالم ج
سنت	خانہ کعبہ	
محصور	مسجد	
حجر اسود	صفہ	
استاد اور معلم	شعب ابی طالب	
واعظ	راستہ	

4- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب سبق کے متن کے مطابق تحریر کریں جو زیادہ سے زیادہ تین سطور پر مشتمل ہوں۔

i- سنت نبویؐ سے کیا مراد ہے؟

ii- کتاب سے کیا مراد ہے؟

iii- خدا کی محبت کا اہل کیسے بنا جاسکتا ہے؟

iv- اسلام تمام انسانوں کو کس کی اتباع کی دعوت دیتا ہے؟

v- حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کن کے لیے ہدایات کا نمونہ اور نجات کا ذریعہ ہے؟

5- درج ذیل اقتباسات کی تشریح سیاق و سباق کے حوالے سے کریں:

”محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مبارک ۔۔۔ جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔“
”بادشاہ ہویا گدا۔۔۔ پیش نظر نہ تھی“

6- مولانا شبلی نعمانیؒ اور سید سلیمان ندویؒ کی مرتب شدہ سیرت النبیؐ کا مطالعہ کریں اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امانت و دیانت کا ایک واقعہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

امتحانی نقطہ نگاہ سے عبارت کی تشریح کا سوال تین اجزاء کا حامل ہوتا ہے: حوالہ متن، سیاق و سباق اور تشریح۔ جواب دیتے ہوئے تینوں اجزاء میں مندرجہ ذیل طریقہ اختیار کیا جائے۔

حوالہ متن:

اقتباس کے بارے میں بتایا جائے کہ وہ کس سبق کا حصہ ہے اور سبق کے مصنف کا نام کیا ہے۔

سیاق و سباق:

سیاق و سباق دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک مثالی، دوسرا جمالی۔ وہ سیاق و سباق مثالی ہے، جو اقتباس کا موقع و محل بتائے یعنی اقتباس سے پہلے اور بعد کے مقامات کا ذکر کرے۔ ایسا مثالی سیاق و سباق اس وقت آسانی سے لکھا جاسکتا ہے، جب اقتباس ایسے سبق میں سے لیا گیا ہو جس میں کہانی کا عنصر موجود ہو۔ دوسرا جمالی سیاق و سباق ہے جو اقتباس سے متعلقہ سبق کے اہم نکات کو بالترتیب مختصراً بیان کر دے۔ جمالی سیاق و سباق ان اسباق کی ضرورت بن جاتا ہے جن میں کہانی کا عنصر نہ پایا جاتا ہو۔ لیکن یہ بات پیش نظر رہے کہ انٹر کے امتحان میں ہر دو قسم کے سیاق و سباق کی طوالت آٹھ سے بارہ سطور کے درمیان رہنی چاہیے۔

تشریح:

عبارات کی تشریح کا مقصد طلبہ کی اس صلاحیت کو جانچنا ہے کہ وہ عبارات کی تفہیم اور وضاحت کی کس قدر اہلیت رکھتے ہیں اور مطالب عبارت کو اپنے الفاظ میں کس قدر خوبی سے سمجھا سکتے ہیں۔ طلبہ کو چاہیے کہ وہ مشکل الفاظ و تراکیب کے معانی اور متبادل لکھیں۔ پھر متعلقہ عبارت میں پیش کیے گئے خیالات اور امثال (اگر ہوں) کی وضاحت ترتیب وار کر دیں۔ ایسا کرتے ہوئے تشریح عموماً اصل عبارت سے تین گنا ہو جانی چاہیے لیکن تشریح کرتے ہوئے سبق کی حدود میں رہنا بہر حال ضروری ہے۔

اپنی مدد آپ

خدا اُن کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں۔

یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ مقولہ ہے۔ اس چھوٹے سے فقرے میں انسانوں کا اور قوموں کا اور نسلوں کا تجربہ جمع ہے۔ ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی ترقی کی بنیاد ہے اور جبکہ یہ جوش بہت سے شخصوں میں پایا جاوے تو وہ قومی ترقی اور قومی طاقت اور قومی مضبوطی کی جڑ ہے۔ جبکہ کسی شخص کے لیے یا کسی گروہ کے لیے کوئی دوسرا کچھ کرتا ہے تو اس شخص میں سے یا اس گروہ میں سے وہ جوش اپنی آپ مدد کرنے کا کم ہو جاتا ہے اور ضرورت اپنی آپ مدد کرنے کی اس کے دل سے مٹتی جاتی ہے اور اسی کے ساتھ غیرت جو ایک نہایت عمدہ قوت انسان میں ہے اور اسی کے ساتھ عزت جو اصلی چمک دیک انسان کی ہے از خود جاتی رہتی ہے اور جبکہ ایک قوم کی قوم کا یہ حال ہو تو وہ ساری قوم دوسری قوموں کی آنکھ میں ذلیل اور بے عزت ہو جاتی ہے۔

یہ ایک نیچے کا قاعدہ ہے کہ جیسا مجموعہ قوم کی چال چلن کا ہوتا ہے۔ یقینی اُسی کے موافق اس کے قانون اور اسی کے مناسب حال گورنمنٹ ہوتی ہے۔ جس طرح کہ پانی خود اپنی پنسل میں آجاتا ہے، اسی طرح عمدہ رعایا پر عمدہ حکومت ہوتی ہے اور جاہل و خراب و ناتربیت یافتہ رعایا پر ویسی ہی اکھڑ حکومت کرنی پڑتی ہے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے کہ کسی ملک کی خوبی و عمدگی اور قدر و منزلت بہ نسبت وہاں کی گورنمنٹ کے عمدہ ہونے کے زیادہ تر اس ملک کی رعایا کے چال چلن، اخلاق و عادت، تہذیب و شانستگی پر منحصر ہے، کیونکہ قوم شخصی حالتوں کا مجموعہ ہے اور ایک قوم کی تہذیب و حقیقت ان مرد و عورت و بچوں کی شخصی ترقی ہے، جن سے وہ قوم بنی ہے۔

قومی ترقی مجموعہ ہے، شخصی محنت، شخصی عزت، شخصی ایمان داری، شخصی ہمدردی کا۔ اسی طرح قومی تنزل مجموعہ ہے شخصی سستی، شخصی بے عزتی، شخصی بے ایمانی، شخصی خود غرضی کا اور شخصی برائیوں کا۔ نا تہذیبی و بد چلنی جو اخلاقی و تمدنی یا باہمی معاشرت کی بدیوں میں شمار ہوتی ہے، درحقیقت وہ خود اسی شخص کی آوارہ زندگی کا نتیجہ ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ بیرونی کوشش سے ان برائیوں کو جڑ سے اُکھاڑ ڈالیں اور نیست و نابود کر دیں، تو یہ برائیاں کسی اور نئی صورت میں اس سے بھی زیادہ زور شور سے پیدا ہو جاویں گی۔ جب تک شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کی حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

اے میرے عزیز ہم وطنو! اگر یہ رائے صحیح ہے تو اس کا یہ نتیجہ ہے کہ قوم کی سچی ہمدردی اور سچی خیر خواہی کرو۔ غور کرو کہ تمہاری قوم کی شخصی زندگی اور شخصی چال چلن کس طرح پر عمدہ ہو تا کہ تم بھی ایک معزز قوم ہو۔ کیا جو طریقہ تعلیم و تربیت کا، بات چیت کا وضع و لباس کا، سیر سپاٹے کا، شغل اشغال کا، تمہاری اولاد کے لیے ہے، اس سے ان کی شخصی چال چلن، اخلاق و عادت، نیکی و سچائی میں ترقی ہو سکتی

ہے؟ حاشا وکلا۔

جبکہ ہر شخص اور کل قوم خود اپنی اندرونی حالتوں سے آپ اپنی اصلاح کر سکتی ہے تو اس بات کی اُمید پر بیٹھے رہنا کہ بیرونی زور انسان کی یا قوم کی اصلاح و ترقی کرے کس قدر افسوس بلکہ نادانی کی بات ہے۔ وہ شخص درحقیقت غلام نہیں ہے جس کو ایک خدا نافرمان نے جو اس کا ظالم آقا کہلایا جاتا ہے خرید لیا ہے یا ایک ظالم اور خود مختار بادشاہ یا گورنمنٹ کی رعیت ہے بلکہ درحقیقت وہ شخص اصلی غلام ہے جو بد اخلاقی، خود غرضی، جہالت اور شرارت کا مطیع اور اپنی خود غرضی کی غلامی میں مبتلا اور قومی ہمدردی سے بے پروا ہے۔ وہ قومیں جو اس طرح دل میں غلام ہیں وہ بیرونی زوروں سے، یعنی عمدہ گورنمنٹ یا عمدہ قومی انتظام سے آزاد نہیں ہو سکتیں جب تک کہ غلامی کی یہ دلی حالت دور نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ جب تک انسانوں میں یہ خیال ہے کہ ہماری اصلاح و ترقی گورنمنٹ پر یا قوم کے عمدہ انتظام پر منحصر ہے، اس وقت تک کوئی مستقل اور برتاؤ میں آنے کے قابل نتیجہ اصلاح و ترقی کا قوم میں پیدا نہیں ہو سکتا۔ گو کیسی ہی عمدہ تہذیبیں گورنمنٹ یا انتظام میں کی جاویں، وہ تہذیبیں فانوس خیال سے کچھ زیادہ رتبہ نہیں رکھتیں، جس میں طرح طرح کی تصویریں پھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں، مگر جب دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔

انسان کی قومی ترقی کی نسبت ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ کوئی خضر ملے، گورنمنٹ فیاض ہو اور ہمارے سب کام کر دے۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ ہر چیز ہمارے لیے کی جاوے اور ہم خود نہ کریں۔ یہ ایسا مسئلہ ہے کہ اگر اس کو ہادی اور رہنما بنایا جاوے تو تمام قوم کی دلی آزادی کو برباد کر دے اور آدمیوں کو انسان پرست بنادے۔ حقیقت میں ایسا ہونا قوت کی پرستش ہے اور اس کے نتائج انسان کو ایسا ہی حقیر بنادیتے ہیں جیسے کہ صرف دولت کی پرستش سے انسان حقیر و ذلیل ہو جاتا ہے۔

بڑا سچا مسئلہ اور نہایت مضبوط جس سے زیادہ دنیا کی معزز قوموں نے عزت پائی ہے وہ اپنی آپ مدد کرنا ہے۔ جس وقت لوگ اس کو اچھی طرح سمجھیں گے اور کام میں لاویں گے تو پھر خضر کو ڈھونڈنا بھول جاویں گے۔ اوروں پر بھروسے اور اپنی مدد آپ، یہ دونوں اصول ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ پچھلا انسان کی بدیوں کو برباد کرتا ہے اور پہلا خود انسان کو۔

قومی انتظام یا عمدہ قوانین کے اجرا کی خواہش، یہ بھی ایک قدیمی غلط خیال ہے۔ سچا اصول وہ ہے جو ولیم ڈارگن نے ڈبلن کی نمائش گاہ دستکاری میں کہا تھا جو ایک بڑا خیر خواہ آئر لینڈ کا تھا۔

اس نے کہا کہ ”جس وقت میں آزادی کا لفظ سنتا ہوں، اسی وقت مجھ کو میرا ملک اور میرے شہر کے باشندے یاد آتے ہیں۔ ہم اپنی آزادی کے لیے بہت سی باتیں سنتے آئے ہیں، مگر میرے دل میں بہت بڑا مضبوط یقین ہے کہ ہماری محنت، ہماری آزادی ہمارے اوپر منحصر ہے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ اگر ہم محنت کیے جاویں اور اپنی قوتوں کو ٹھیک طور پر استعمال کریں تو اس سے زیادہ ہم کو کوئی موقع یا آئندہ کی قوی توقع اپنی بہتری کے لیے نہیں ہے۔ استقلال اور محنت کامیابی کا بڑا ذریعہ ہے۔ اگر ہم ایک دلی ولولے اور محنت سے کام کیے جائیں گے تو مجھے پورا یقین ہے کہ تھوڑے زمانے میں ہماری حالت بھی ایک عمدہ قوم کی مانند آرام و خوشی و آزادی کی ہو جاوے گی۔“

انسان کی اگلی پشتوں کے حالات پر خیال کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی موجودہ حالت انسانوں کے نسل در نسل کے کاموں

سے حاصل ہوئی ہے۔ محنتی اور مستقل مزاج محنت کرنے والوں، زمین کے جوتنے والوں، کانوں کے کھودنے والوں، نئی نئی باتوں کے ایجاد کرنے والوں، مخفی باتوں کو ڈھونڈ کر نکالنے والوں، آلات جراثیم سے کام لینے والوں اور ہر قسم کے پیشہ کرنے والوں، ہنرمندوں، شاعروں، حکیموں، فیلسوفوں، ملکی منتظموں نے انسان کو موجودہ ترقی کی حالت پر پہنچانے میں بڑی مدد دی ہے۔ ایک نسل نے دوسری نسل کی محنت پر عمارت بنائی ہے اور اس کو ایک اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے۔ ان عمدہ کاریگروں سے جو تہذیب و شائستگی کی عمارت کے معمار ہیں، لگاتار ایک دوسرے کے بعد ہونے سے محنت اور علم و ہنر میں جو ایک بے ترتیبی کی حالت میں تھی ایک ترتیب پیدا ہوئی ہے۔ رفتہ رفتہ نیچر کی گردش نے موجودہ نسل کو اس زرخیز اور بے بہا جائیداد کا وارث کیا ہے جو ہمارے پُرکھوں کی ہوشیاری اور محنت سے مہیا ہوئی تھی اور وہ جائیداد ہم کو اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ ہم صرف مثل مار سرگج اس کی حفاظت ہی کیا کریں۔ بلکہ ہم کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس کو ترقی دیں اور ترقی یافتہ حالت میں آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ جاویں۔ مگر افسوس صد ہزار افسوس کہ ہماری قوم نے ان پُرکھوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد کو بھی گرا دیا۔

ایک نہایت عاجز و مسکین غریب آدمی جو اپنے ساتھیوں کو محنت اور پرہیزگاری اور بے لگاؤ ایمان داری کی نظیر دکھاتا ہے، اس شخص کا اس کے زمانہ میں اور آئندہ زمانے میں اس کے ملک، اس کی قوم کی بھلائی پر بہت بڑا اثر پیدا ہوتا ہے کیونکہ اس کی زندگی کا طریقہ اور چال چلن کو معلوم نہیں ہوتا مگر اور شخصوں کی زندگی میں خفیہ خفیہ پھیل جاتا ہے اور آئندہ کی نسل کے لیے ایک عمدہ نظیر بن جاتا ہے۔

ہر روز کے تجربے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شخصی چال چلن میں یہ قوت ہے کہ دوسرے کی زندگی اور برتاؤ اور چال چلن پر نہایت قوی اثر پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں یہی ایک نہایت عمدہ عملی تعلیم ہے۔

یہ علم وہ علم ہے، جو انسان کو انسان بناتا ہے۔ اسی علم سے عمل، چال چلن، تعلیم نفسی، نفس کشی، شخصی خوبی، قومی مضبوطی، قومی عزت حاصل ہوتی ہے۔ یہی علم وہ علم ہے کہ جو انسان کو اپنے فرائض ادا کرنے اور دوسروں کے حقوق محفوظ رکھنے اور زندگی کے کاروبار کرنے اور اپنی عاقبت کے سنوارنے کے لائق بنادیتا ہے۔ اس تعلیم کو آدمی صرف کتابوں سے نہیں سیکھ سکتا اور نہ یہ تعلیم کسی درجے کی علمی تحصیل سے حاصل ہوتی ہے۔ مشاہدہ آدمی کی زندگی کو درست اور اس کے علم کو باعمل، یعنی اس کے برتاؤ میں کر دیتا ہے۔ علم کے بہ نسبت عمل اور سوانح عمری کی بہ نسبت عمدہ چال چلن آدمی کو زیادہ تر معزز اور قابل ادب بناتا ہے۔

(مقالات سرسید جلد پنجم)

مشق

1- ”اپنی مدد آپ“ کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین تین سطور سے زیادہ نہ ہوں۔

i- وہ کون سا آزمودہ مقولہ ہے جس میں انسانوں اور قوموں کا تجربہ جمع ہے؟

ii- سرسید کے خیال میں کون سی قوم ذلیل و بے عزت ہو جاتی ہے؟

iii- نیچر کا قاعدہ کیا ہے؟

- iv قومی ترقی کن خوبیوں کا مجموعہ ہے؟
- v قومی منزل کن برائیوں کا مجموعہ ہے؟
- vi بیرونی کوشش سے برائیوں کو ختم کرنے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے؟
- vii سرسید کے خیال میں اصلی غلام کون ہے؟
- viii دنیا کی معزز قوموں نے کس خوبی کی وجہ سے عزت پائی؟
- ix ولیم ڈراگن کے اصول کا مفہوم بیان کیجیے۔
- x کون سی خوبی آدمی کو معزز اور قابل ادب بناتی ہے؟

2- ”اپنی مدد آپ“ کے متن کو مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ”خدا ان کی مدد کرتا ہے جو آپ اپنی مدد کرتے ہیں“ یہ ایک نہایت عمدہ اور آزمودہ:

- (الف) کہاوت ہے (ب) مقولہ ہے
- (ج) ضرب المثل ہے (د) محاورہ ہے
- ii- ایک شخص میں اپنی مدد کرنے کا جوش اس کی سچی
- (الف) تنزلی کی بنیاد ہے۔ (ب) شہرت کی بنیاد ہے۔
- (ج) عزت کی بنیاد ہے۔ (د) ترقی کی بنیاد ہے۔

3- سبق ”اپنی مدد آپ“ کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملے مکمل کریں۔

- i- خدا ان کی مدد کرتا ہے جو..... مدد کرتے ہیں۔
- ii- جس طرح پانی خود..... میں آ جاتا ہے۔
- iii- قوم شخصی..... کا مجموعہ ہے۔
- iv- قوم کی سچی..... کرو۔
- v- ہم لوگوں کے یہ خیال ہیں کہ..... ملے۔

4- ”اپنی مدد آپ“ کا مرکزی خیال لکھیں جو دو جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

5- سرسید کے مضمون ”اپنی مدد آپ“ کا خلاصہ لکھیں۔

6- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح لکھیے۔

تمام تجربوں سے ثابت ہوا ہے..... حالتوں کو ترقی نہ کی جاوے۔

سر سید کے اخلاق و خصائل

دوستوں اور مہمانوں سے ان کا دسترخوان بہت کم خالی ہوتا تھا۔ جس دن کوئی مہمان نہ ہوتا وہ کھانا کھاتے وقت بٹاش نہ ہوتے تھے اور جس دن زیادہ مہمان ہوتے اس دن ان کے گھر عید ہوتی تھی۔ کھانوں میں زیادہ تر تعداد اور تلون نہیں ہوتا تھا مگر کھانا عموماً عمدہ ہوتا تھا۔ اگر کسی موقع پر کھانا عمدہ نہیں ملتا تھا تو جیسا مل جاتا تھا خوشی سے، بغیر ناک منہ چڑھائے سیر ہو کر کھا لیتے تھے۔ فصل کی ترکاریاں اور فواکہ خصوصاً آم اور خرپوزے نہایت مرغوب تھے۔ سنا ہے کہ پہلے خوراک زیادہ تھی مگر بڑھاپے میں بہت گھٹ گئی تھی، البتہ بعد کھانا کھانے کے کوئی پاؤ پاؤ سیر دودھ دونوں وقت بلا ناعدہ پی لیتے تھے۔

ظرافت اور خوش طبعی ان کی جبلت میں داخل تھی مگر جس طرح ان کی اور باتوں میں بناوٹ نہ تھی اسی طرح ظرافت اور خوش طبعی میں مطلق تصنع نہ تھا۔ تحریر میں، تقریر میں، بات چیت میں جو لطیفہ یا شوخی ان کو سوجھ جاتی تھی اگرچہ کیسی ہی شرم و حجاب کی بات ہو ان سے ضبط نہ ہو سکتی تھی مگر ہر ایک امر کے بیان کرنے کا خدا نے ایسا سلیقہ دیا تھا کہ کوئی بات تہذیب کی حد سے متجاوز نہ ہونے پاتی تھی۔ مطالعہ کی عادت ابتدا سے ان کی رفیق کار رہی۔ سر سید کا مطالعہ نہ صرف دل بہلانے یا عبارت کا لطف اٹھانے کے لیے ہوتا تھا اور نہ کتاب دانی کی غرض سے جیسا کہ مدرس اور طلبہ کتاب کے ایک ایک لفظ اور جملے اور تراکیب پر غائر نظر کرتے ہیں بلکہ ان کا مطلب صرف مصنف کے خیالات سے اطلاع حاصل کرنا ہوتا تھا۔ جو بات کتاب میں ان کے کام کی ہوتی تھی اس پر پنسل سے نشان کر دیتے تھے اور اگر کوئی مضمون کسی اخبار میں کام کا ہوتا تھا اس ورق کو الگ کر کے اپنے اخبار کی فائل میں جو ہر وقت سامنے رکھا رہتا تھا چسپاں کر دیتے تھے۔

خطوں کا جواب دینے میں وہ نہایت فیاض تھے۔ جو خط پانی پت سے علی گڑھ بھیجا جاتا ہے اگر وہاں پہنچتے ہی اس کا جواب لکھا جائے تو تیسرے دن وہاں سے جواب آ جاتا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میرے خط کا جواب چوتھے دن آیا ہو یا بالکل نہ آیا ہو۔ جب کہ ان کا برتاؤ ہم لوگوں کے ساتھ یہ تھا تو دیکھنا چاہیے کہ اپنے خاص دوستوں اور ہم سروں اور ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ کیسا ہوگا۔

محنت اور جفاکشی کی قابلیت بھی سر سید کے خاص اوصاف میں سے تھی۔ قطع نظر اس کے کہ ابتدا سے ان کو کام کرنے کی عادت رہی ان کے قوی میں فطرتاً مشکلات کے برداشت کرنے اور کسی کام سے ہمت نہ ہارنے کی لیاقت اور استعداد رکھی گئی تھی اور ظاہراً ان کی غیر معمولی ذہانت بھی ان کے دائمی غور و فکر اور دماغی محنت کا نتیجہ تھی کیونکہ بچپن میں جیسا کہ خود سر سید کے بیان سے معلوم ہوا ہے وہ باعتبار ذہانت و جدت کے اپنے ہم چشموں میں کچھ زیادہ امتیاز نہ رکھتے تھے مگر چونکہ انھوں نے اپنے تمام قوی سے جو خدا تعالیٰ نے ان کے نفس میں ودیعت کیے تھے پورا پورا کام لیا تھا اور اس لیے ان کے ذہن و حافظہ اور عقل سب کوجلا ہو گئی تھی۔

ولایت میں خطبات احمدیہ کے لکھنے میں انھوں نے ڈیڑھ برس برابر ایسی محنت شاقہ کی جس سے آخر کار ان کے پاؤں میں ایک مرض پیدا ہو گیا جو اخیر دم تک زائل نہیں ہوا۔ جس زمانے میں سائینٹیفک سوسائٹی کا مکان بنوار ہے تھے سخت گرمی کا موسم تھا۔ شام تک لو چلتی تھی اور کچہری سے آکر خس کی ٹٹی اور پنکھا چھوڑ کر سیدھے سوسائٹی پہنچتے تھے اور عصر اور مغرب کی نمازیں وہیں پڑھتے تھے۔

وہ ہمیشہ جب کام سے خالی ہوتے تھے ہنسی دل لگی اور دوستوں کی صحبت سے اپنے دل کو خوش کرتے تھے۔ بچوں سے، بوڑھوں سے، جوانوں سے، دوستوں سے، ملازموں سے، ہنسی اور چہل کیے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ یہی زندہ دلی تھی جو ان سے سخت محنت کراتی تھی اور نکان اور ماندگی اور ملال و کلال کو کبھی پاس نہ آنے دیتی تھی۔ بعض اوقات ان کے ماتحت یا ملازم جن سے بے تکلفی تھی ان کو ایسا جواب دیتے تھے جس سے انھیں شرمندہ ہونا چاہیے تھا مگر وہ کبھی برانہ ماننے تھے بلکہ خوب قہقہے لگاتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ غرضیکہ سرسید نے تائبہ و رکبھی رنج و غم کو پاس نہیں آنے دیا۔ بیرونجات میں، آبادی میں، جنگل میں، جہاں کہیں ہوئے انھوں نے اپنی خوشی اور دل لگی کا کچھ سامان ضرور مہیا کر لیا۔ وہ اپنی باتوں سے نہ صرف بڑوں کو بلکہ بچوں کو بھی تسخیر کر لیتے تھے، یہاں تک کہ جو وحشت بچوں کو بڑے بوڑھوں کی صحبت سے ہوتی تھی وہ ان میں باقی نہ رہی تھی۔

راست بازی اور وہ تمام اوصاف جو ایک راست باز آدمی میں ہونے ضروری ہیں، جیسے صدق، مؤدت، حمیت، دلیری اور آزادی وغیرہ اس شخص کی خصوصیات میں سے تھے۔ اس شخص نے اگر سچ پوچھیے تو اپنی آزادانہ تحریروں سے اردو لٹریچر میں آزادی اور سچائی کی بنیاد ڈال دی۔ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ سچ بات کہنے میں کسی کی طعن و ملامت سے نہ ڈریں۔ جو بات اس کو حق معلوم ہوئی، اس کے کہنے میں کبھی اس بات کا خیال نہیں کیا کہ دنیا میں کوئی دوسرا شخص بھی اس بات میں اس کے ساتھ اتفاق کرنے والا ہے یا نہیں۔ سرسید کو کوئی بات اس سے زیادہ شاق نہیں گزرتی تھی کہ ان پر راست بازی کے خلاف کوئی الزام لگایا جائے کہ یہ شخص فی الواقع راست بازی کو اپنا دین و ایمان سمجھتا تھا۔ سرسید جیسے خود راست باز تھے اسی طرح راست بازوں کی دل سے قدر کرتے تھے۔ دوسرے محبت اور التفات کا مادہ سرسید میں معمولی آدمیوں سے بہت زیادہ تھا اور اسی لیے ان کے تمام تعلقات میں محبت کا ظہور بدرجہ غایت پایا جاتا ہے۔

سرسید کو ہمیشہ اپنے کنبے کے ساتھ حد سے زیادہ لگاؤ رہا ہے۔ بھائی کی موت کا صدمہ ان کو بیس برس نہیں بھولا۔ سنا ہے کہ ان کے عزیزان کے سامنے بھائی کا ذکر اس لیے نہیں کرتے ہیں کہ ان کا داغ تازہ ہو جائے گا۔ بہت مدت کے بعد ان کی بھتیجی کے منہ سے باپ کا کچھ ذکر نکل گیا تھا۔ سرسید کی حالت ایسی متغیر ہو گئی کہ گویا آج ہی بھائی کا انتقال ہوا ہے۔ اپنی والدہ کے ساتھ جیسی ان کو وابستگی تھی ایسی بہت ہی کم سنی گئی ہے اور جیسی کہ وہ جوانی میں اطاعت و فرمانبرداری کرتے تھے اور ان کے غصے اور خفگی کو برداشت کرتے تھے، اس طرح بچے بھی اپنے ماں باپ کا کہا نہیں مانتے۔

اپنے وطن کے ساتھ ہر شخص کو عموماً الفت و موانست ہوتی ہے۔ مگر سرسید کی محبت اپنے وطن کے ساتھ عجیب طرح کی تھی۔ گو بظاہر سرسید نے دلی ہمیشہ کے لیے چھوڑ دی تھی۔ ان کے آرمیکلوں میں یا استیچوں اور لیکچروں میں یا پرائیویٹ خطوں میں جہاں کہیں دلی کا ذکر آ گیا ہے ان کا دل اُنڈے بغیر نہیں رہا۔ اگر غور کر کے دیکھا جائے تو سرسید کے دل میں قوم کی بھلائی کا خیال اور قومی ہمدردی کا جوش

زیادہ تر دلی ہی کی تباہی اور بربادی نے پیدا کیا۔ سرسید جیسے ذکی الحس آدمی کے لیے یہ انقلاب ایک تازیانہ تھا۔ دلی کا سناٹا دیکھ کر ایسی چوٹ ان کے دل پر لگی جو رفتہ رفتہ اور آخر کار ناسور بن گئی۔

جو برتاؤ سرسید کا دوستوں کے ساتھ تھا وہ اس زمانے کے دوستوں سے بہت نرالا تھا۔ جہاں تک ان کا حال دیکھا گیا، ان کی خوشی بلکہ ان کی زندگی کا مدار صرف دو چیزوں پر معلوم ہوتا تھا۔ کام اور دوستوں کی ملاقات سے ان کو شاید ہی کبھی ایسی خوشی ہوتی ہو جیسے اپنے خالص اور مخلص دوستوں سے مل کر ہوتی تھی۔ وہ فی الواقع دوستوں کو زندگی کا ایک عنصر سمجھتے تھے۔

نواب محسن الملک نے ایک موقع پر سرسید کا ذکر خیر کرتے وقت کہا کہ میں نے کسی شخص کی ذات میں اس قدر خوبیاں جمع نہیں دیکھیں۔ میری ان سے پہلی ملاقات ۱۸۶۱ء میں ہوئی تھی۔ اس وقت سے آج تک ایک بات بھی ان میں ایسی نہیں دیکھی جس کو برا کہہ سکوں۔ اس شخص کی سچی محبت اور وفاداری دنیا میں کہیں نہیں دیکھی۔ البتہ کتابوں میں بہت کچھ لکھا دیکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ بھائی سے اس قدر ہو سکی ہے اور نہ باپ سے جیسی کہ اس شخص کی محبت خدا نے ڈال دی ہے۔ ان کا قول تھا کہ دوستی کے آگے رشتہ و قرابت کی کچھ حقیقت نہیں۔

اس جلی مہر و محبت کا مقننا تھا کہ وہ اپنے رفیقوں اور نوکروں اور لگے بندھوں کو تادمقد و ر عمر بھر اپنے ساتھ بنا ہونا چاہتے تھے۔ جس شخص کے قدم ان کے ہاں جم گئے پھر نہ وہ اس کو اپنے پاس سے جدا کرنا چاہتے تھے اور نہ وہ ان سے جدا ہونا چاہتا تھا۔ اول تو وہ کسی کی شکایت سنتے نہ تھے اور اگر کوئی کسی ملازم کی کوئی شکایت کرتا تھا تو اس کا کچھ اثر نہ ہوتا تھا۔ ان کے ایک قدیم ملازم کی لوگوں نے ان سے بار بار شکایت کی مگر وہ کسی طرح ان کے دل سے نہ اترتا۔ ہمیشہ ان کا معتمد علیہ اور سفر و حضر میں ان کے ہمراہ رہا اور آخر انھیں کی رفاقت میں مر گیا۔

سیر چشمی اور فراخ حوصلگی سرسید کے خاص اوصاف میں سے تھے۔ انھوں نے اپنی کمائی سے نہ کبھی مال جمع کرنے کا ارادہ کیا اور نہ اولاد کے لیے کوئی جائیداد خریدی بلکہ جو کچھ کمایا اس کو یا اپنی ضروری آسائش اور سچی عزت اور نیک نامی کے ذرائع میں صرف کیا یا کنبہ کی خبر گیری، مستحقوں کی امداد، اولاد کی تعلیم، ملک اور قوم کی بھلائی اور مذہب کی حمایت میں اٹھایا۔

ابتداء سے ان کا یہ حال رہا کہ جس کام کی لہر ان کے دل میں اٹھی، اس پر روپیا صرف کرنے میں انھوں نے کبھی پس و پیش نہیں کیا۔ وہ اپنے کھانے، پہننے کے اخراجات میں تنگی کر سکتے تھے اور کرتے تھے مگر اپنے شوق کے کاموں میں انھوں نے کبھی مضائقہ نہیں کیا۔ جس کتاب کی ان کو تلاش ہوئی اگر وہ پس گئی قیمت پر بھی ملی تو اس کو لیے بغیر نہیں چھوڑا۔

مستحقوں کی امداد و تنگی کرنے کی بھی ان کی نسبت بے شمار مثالیں سننے میں آئی ہیں۔ سرسید کی جو انفرادی اور فیاضی صرف اسی میں محدود نہ تھی بلکہ ان کی مثال ایک پھل دار درخت کی سی تھی جو اپنے پھل سے، اپنے سائے سے اور اپنی لکڑی سے غرض کہ ہر طرح سے مخلوق کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

غریب پیشہ وروں اور مزدوروں کے ساتھ جو فیاضانہ برتاؤ اس شخص کا تھا اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ جب سے وہ مستقل طور پر

علی گڑھ میں مقیم ہوئے مزدوروں کی مزدوری اور گاڑیوں کا کرایہ پہلے کی نسبت عموماً زیادہ ہو گیا۔ وہ ہمیشہ لوگوں کو ان کی توقع اور حوصلے سے بہت زیادہ دیتے تھے اور جہاں کہیں ان کا رہنا ہوا یہ لوگ ان کے نہایت شکر گزار رہے۔

سر سید کے ایک دوست ایک زمانے میں ان کے خانگی اخراجات کا حساب لکھا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ جب مہینہ ختم ہوا میں تمام اخراجات کا مختصر گوشوارہ بنا کر ان کو دکھانے کے لیے لے گیا۔ سر سید نے کہا ”بس مجھے دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یوں ہی چلنے دو۔ میں دیکھوں گا تو ناحق میرے دل کو صدمہ ہوگا۔“ حق یہ ہے کہ جو شخص رات دن اوروں کی اصلاح و فلاح میں رہے گا وہ اپنے خانگی انتظام کی طرف کیونکر متوجہ ہو سکتا ہے۔

مخالفوں اور دشمنوں کی برائیوں کا تحمل کرنا اور کبھی ان سے انتقام لینے کا ارادہ نہ کرنا یہ بھی سر سید کے اُن اوصاف میں سے تھا جو ان کی ذات کے ساتھ مخصوص تھے۔ اگرچہ سر سید فطرتاً نہایت عالی ظرف اور عالی حوصلہ پیدا ہوئے تھے اور عفو و اغماض ان کی سرشت میں داخل تھا مگر ان کی ابتدائی روک ٹوک اور حسن ترتیب سے یہ تمام ملکات ان کی طبیعت میں اور زیادہ راسخ ہو گئے تھے۔ نیک اور عاقل ماں نے بیٹے کے دل میں یہ بات ڈالی تھی کہ سب سے بہتر تو یہ ہے کہ بروں کی برائی سے بالکل درگزر کی جائے اور اگر بدلہ ہی لینے کا خیال ہو تو اس بڑے اور زبردست انتقام لینے والے کے انصاف پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی نے لڑکپن میں یہ سبق پڑھایا تھا کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ برائی کرنا خود اپنے آپ کو ویسا ہی بنانا ہے۔

سر سید کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے کوشش کرتے تھے، امر اسے ملتے تھے، حاکمان وقت سے میل جول رکھتے تھے اور دنیا داروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے، کہا جاسکتا تھا کہ وہ دنیا دار ہیں لیکن ان کی حالت پر نظر کرنے سے یہ مشکل ان کو غریبی معنوں میں دنیا دار نہ کہہ سکتے تھے۔

یہ شخص اپنے فرائض کے سوا جن کو وہ اپنے اوپر لازم سمجھتا تھا، درحقیقت کسی چیز سے تعلق نہ رکھتا تھا۔ باوجود وہ قطعی مایوسی کے جو اس کو مسلمانوں کی طرف سے تھی اور جس کو وہ اکثر پرائیویٹ صحبتوں میں نہایت افسوس کے ساتھ ظاہر کرتا تھا اس کی کوششیں آخر دم تک برابر جاری رہیں۔ یہ اسی کی ہمت اور اسی کا حوصلہ تھا جو اس کی ذات پر ختم ہو گیا۔

وہ ان لوگوں میں سے نہ تھا جو لوگوں کو دنیا سے نفرت دلاتے ہیں اور خود مال و دولت جمع کرتے ہیں بلکہ وہ شخص تھا جو ایک امید موہوم پر کہ شاید قوم دنیوی ذلت سے نکلے، اپنا دھن تن من سب قوم پر قربان کر گیا۔

(حیات جاوید)

مشق

- 1- درست جواب کے شروع میں ✓ کا نشان لگائیں۔
 - i- ”سرسید کے اخلاق و خصائل“ کے مصنف کا نام کیا ہے؟
 - ا- مولانا حالی
 - ب- مولانا شبلی نعمانی
 - ج- خواجہ حسن نظامی
 - د- سید عبداللہ
 - ii- ایہ مضمون کس کتاب سے ماخوذ ہے؟
 - ا- ”تاریخ ادب اردو“ سے
 - ب- ”مقالات سرسید“ سے
 - ج- ”یادگارِ غالب“ سے
 - د- ”حیات جاوید“ سے
 - iii- سرسید کو کون سا پھل مرغوب تھا؟
 - ا- سیب
 - ب- انگور
 - ج- آم
 - د- انار
 - iv- سرسید کی مرغوب غذا کیا تھی؟
 - ا- کھیر
 - ب- دال
 - ج- گوشت
 - د- جوں جوں جائے
 - v- سرسید کھانے کے بعد کیا پیتے تھے؟
 - ا- چائے
 - ب- کافی
 - ج- دودھ
 - د- کچھ بھی نہیں
- 2- مختصر جواب دیں۔
 - i- کیا سرسید خطوں کے جواب باقاعدہ دیتے تھے؟
 - ii- کیا سرسید کو مہمانوں کی آمد ناگوار گزرتی تھی؟
 - iii- سرسید کی شخصیت کا نمایاں ترین پہلو کیا تھا؟
 - iv- سرسید راست بازی کو کیا سمجھتے تھے؟
 - v- سرسید کا دوستوں سے برتاؤ کیسا تھا؟
 - vi- سرسید کو کون سا پھل پسند تھا؟
 - vii- سرسید کھانے کے بعد عموماً کیا پیتے تھے؟
 - viii- سرسید نے مطالعے کی عادت کب سے اپنائی؟
 - ix- سرسید نے خطبات احمدیہ کتنی مدت میں لکھی؟
 - x- کون سی بات سرسید کو سب سے زیادہ ناگوار گزرتی تھی؟

3- متن کو پیش نظر رکھ کر خالی جگہ پر کریں۔

i- سرسید کو اپنے کتبے سے حد سے زیادہ..... تھا۔

ii- سرسید فطرتا علی ظرف اور..... تھے۔

iii- سرسید اپنی باتوں سے بڑوں بلکہ بچوں کو بھی..... کر لیتے تھے۔

iv- سرسید مذہبی..... سے پاک تھے۔

v- سچ بات کہنے میں کسی کی..... سے نہ ڈریں۔

4- ”سرسید کے اخلاق و خصائل“ کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

5- مندرجہ ذیل اقتباس کی سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کریں۔

دوستوں اور مہمانوں سے ان کا دسترخوان..... بلاناغہ پی لیتے تھے۔

6- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

بشاش۔ خوش طبعی۔ شرم و حجاب۔ فیاض۔ رنج و غم۔

7- مندرجہ ذیل الفاظ پر اعراب لگا کر ان کا درست تلفظ واضح کریں:-

خصائل۔ جبلت۔ ضبط۔ فیاض۔ متصل۔

8- مندرجہ ذیل الفاظ کی جمع لکھیں۔

خصلت۔ لطیفہ۔ عادت۔ ورق۔ تصنیف

9- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں۔

کم۔ مہمان۔ ابتدا۔ جواب۔ دائمی۔

ابوالقاسم زہراوی

اندلس کی اسلامی سلطنت کے بعض نامور سائنس دان بلاشبہ اپنے اپنے فن میں مہارت تامہ رکھتے تھے لیکن اس دور کی سب سے عظیم شخصیت، جس کے کمال کا لوہا ہمدیوں تک اہل مغرب مانتے رہے، ابوالقاسم خلف بن عباس زہراوی ہے۔

سپین کے مشہور حکمران عبدالرحمان الناصر نے اپنے دارالسلطنت قرطبہ سے چار میل کے فاصلے پر ایک عظیم الشان محل تعمیر کروایا تھا اور اس کا نام اپنی ملکہ زہرا کے نام پر ”قصر زہرا“ رکھا تھا۔ رفتہ رفتہ اس قصر کے گرد اعیان سلطنت اور دوسرے لوگوں نے اپنے مکان بنالے اور وہاں ایک علیحدہ شہر بس گیا جو ”الزہرا“ کے نام سے موسوم ہوا۔ یہی ذیلی شہر ابوالقاسم خلف بن عباس کا مرزبوم تھا اور اسی شہر کی نسبت سے ”زہراوی“ کا لقب اس کے نام کا جزو بن گیا ہے۔

ابوالقاسم زہراوی کے آباؤ اجداد اندلس ہی کے رہنے والے تھے۔ اس کی ولادت ۹۳۶ء میں عبدالرحمان الناصر ہی کے عہد میں ہوئی جو شاہان اندلس میں آٹھواں فرمانروا تھا۔ اس کے عہد میں اندلس کا دارالسلطنت قرطبہ اوج پر پہنچا ہوا تھا۔ چنانچہ اس کی شان و شوکت کا اندازہ اس امر سے ہو سکتا ہے کہ اس میں تین ہزار آٹھ سو مسجدیں، ساٹھ ہزار سربفلک عمارتیں، عام لوگوں کے دو لاکھ مکانات، آٹھ ہزار دکانیں اور سات سو حمام تھے۔ قرطبہ کی آبادی دس لاکھ باشندوں پر مشتمل تھی جس میں پچاس سرکاری ہسپتال موجود تھے۔ قرطبہ کی شاہی لائبریری میں دو لاکھ سے زائد کتابیں تھیں۔ قرطبہ یونیورسٹی اس زمانے میں مغرب کی عظیم ترین یونیورسٹی تھی جہاں مختلف مضامین کے جلیل القدر علماء تعلیم و تدریس اور تحقیق و تالیف میں مصروف رہتے تھے۔ یہی وہ ماحول تھا جس میں ابوالقاسم زہراوی نے اپنا لڑکپن اور جوانی گزاری۔ اس کے کمال فن کو دیکھ کر یہ اندازہ آسانی سے کیا جاسکتا ہے کہ اس نے اس علمی ماحول سے پورا فائدہ اٹھایا اور طب میں، جو اس کا خاص مضمون تھا، کامل دست گاہ حاصل کی۔ اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد وہ قرطبہ کے شاہی شفاخانے کے ساتھ منسلک ہو گیا اور یہاں اس نے اُس عملی تحقیق کا آغاز کیا جس نے تھوڑے ہی عرصے میں اس کو جدید علم الجراحات کا موجد اور اپنے زمانے کا سب سے بڑا سرجن (Surgeon) بنا دیا۔

موجودہ زمانے میں علم علاج کے جو دو طریقے یعنی علاج بالذوا (میڈیسن) اور علاج بالجراحات (سرجری) ہسپتالوں میں مروجہ ہیں، ان کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ اگرچہ مغربی طب، یعنی ایلیوپیتھی دیسی طب ہی کا چرہ ہے، مگر جراحات، یعنی سرجری خاص مغربی ڈاکٹروں کی چیز ہے جس میں کوئی ان کا ہم سر نہیں ہے۔ لیکن اس خیال کے پھیلنے کی وجہ محض یہ ہے کہ ہمارے عوام اسلامی دور کے عظیم سرجن ابوالقاسم زہراوی کے نام اور اس کے کارناموں سے واقف نہیں، ورنہ یہ حقیقت ہے کہ زہراوی ہی وہ عظیم شخصیت ہے جس نے اہل یورپ کو سرجری کے فن سے روشناس کرایا۔

”زہراوی“ عربی زبان کا لفظ ہے۔ اسے ”زہراوی“ بھی لکھتے ہیں۔ لکھنے کے یہ دونوں انداز درست ہیں۔

ابوالقاسم الزہراوی سرجری میں جو نادر آپریشن انجام دیتا تھا، اپنے روز افزوں تجربے سے اس فن میں جو نئی نئی راہیں دریافت کرتا تھا، آپریشن کرنے کے لیے اپنی نگرانی میں جو نئے نئے آلات بنواتا تھا، ان سب کی تفصیل وہ احاطہ قلم میں لاتا جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کے قلم سے عملی سرجری پر ایک یگانہ روزگار تصنیف ظہور میں آگئی جو صدیوں تک یورپ کی یونیورسٹیوں میں سرجری کی واحد معیاری کتاب کے طور پر داخل درس رہی۔

زہراوی کی اس کتاب کا نام ”تصریف“ ہے۔ یہ پوری کتاب تو علم علاج کی دونوں شاخوں طب یعنی میڈیسن اور جراحی یعنی سرجری پر مشتمل ہے، لیکن اس کا سب سے اہم حصہ سرجری کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے طب یعنی میڈیسن پر تو عربی میں بہت سی کتابیں لکھی جا چکی تھیں لیکن جراحی یعنی سرجری پر اعلیٰ معیار کی پہلی مفصل کتاب ”تصریف“ کا ذکر آتا ہے تو اس سے ”تصریف“ یعنی سرجری کی کتاب ہی مراد ہوتی ہے۔

”تصریف“ تین بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کا پہلا حصہ داغ دینے کے متعلق ہے جو ازمنہ وسطیٰ تک بعض امراض کے علاج میں برتا جاتا تھا۔ ”تصریف“ کے دوسرے اور تیسرے حصے میں عملی جراحی کا بیان ہے اور یہی اس کتاب کے اہم ترین حصے ہیں۔ ان میں دانت نکالنے، آنکھوں کا آپریشن کرنے، حلق کا کواکائٹ، مثانے میں سے پتھری نکالنے، بواسیر کے متوں کو کاٹنے، خنازیر کا آپریشن کرنے، ٹوٹی ہڈی کو جوڑنے، اترے ہوئے جوڑوں کو چڑھانے، ماؤف عضو کو کاٹنے اور ہر قسم کے پھوڑوں کو چیرنے کی تفصیلات دی گئی ہیں۔

مختصر یہ کہ جراحی میں ۹۰ فی صد جن اعمال سے ایک سرجن کو سابقہ پڑتا ہے ان میں سے کسی کی تفصیل اس تصنیف میں چھوٹ نہیں گئی۔ ان اعمال جراحی کے لیے جن آلات کی ضرورت ہوتی ہے، ان کی تشریح نہایت خوب صورت تصاویر سے کی گئی ہے۔ ان آلات میں قاطع طیر، یعنی پیشاب خارج کرنے کا آلہ، مقامع الانسان، یعنی دانت نکالنے کا آلہ، محضن یعنی انہا کرنے کا آلہ، مختلف قسم کے نشتر، قینچی، آری، سرجنوں کی سلائی، زخموں کے سینے کے لیے مختلف شکل کی سونیاں، سبھی شامل ہیں۔ ان میں سے ہر آلے کی ساخت تصویر کی مدد سے اور طریق استعمال الفاظ کے ذریعے سمجھایا گیا ہے۔ ”تصریف“ سے پہلے جراحی پر نہ اتنے پائے کی کوئی کتاب لکھی گئی تھی اور نہ علم جراحی کے متعلق اتنی خوبصورت تصاویر شائع کی گئی تھیں۔

”تصریف“ کی نمایاں خصوصیات میں فاضل مصنف نے اس میں جا بجا اپنے تجربات کی روشنی میں سرجری کے متعلق ایسی تصریحات کی ہیں جن سے طبی دنیا اس سے پہلے بے خبر تھی۔ زہراوی کا طرز بیان عام فہم اور زبان سادہ ہے۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتا ہے اس کے تمام رموز اس خوبی سے بیان کرتا ہے کہ قاری کے لیے کسی قسم کا الجھاؤ باقی نہیں رہتا۔ پھر بعض دیگر طبی مصنفوں کی طرح وہ فلسفیانہ موشگافیوں میں نہیں الجھا بلکہ اپنے فن کے عملی پہلوؤں کو سامنے رکھتا ہے اور صرف انہی امور کی توضیح کرنا ضروری خیال کرتا ہے جو عملی افادیت کے حامل ہوں۔

اہل مغرب، جو مسلمانوں کے ناموں کو بگاڑنے میں خاص مہارت رکھتے ہیں، ابوالقاسم زہراوی کو ابوالکاس (Abulcasis)، ابو کاس (Albucasis) اور الزہراویس (Alzharawius) کے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔

یورپ میں ازمنا وسطی سے لے کر اٹھارویں صدی تک کے تمام مغربی مصنف، جنہوں نے سرجری پر کتابیں لکھی ہیں، ابوالقاسم زہراوی کی فنی قابلیت کے معترف ہیں اور جابجا اس کی کتاب سے حوالے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض نے تو صاف طور پر اس امر کا اظہار کیا ہے کہ فن جراحہ میں زہراوی ایک استاد کامل کی حیثیت رکھتا ہے اور اہل یورپ نے ابتداً سرجری میں جو کچھ حاصل کیا ہے وہ صرف زہراوی ہی کی بدولت ہے۔

زہراوی کی کتاب ”تصریف“ صدیوں تک یورپ کی تمام بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں داخل درس رہی اور مغرب کے سرجن اس کتاب کے مندرجات کو سند کے طور پر پیش کرتے رہے۔

”تصریف“ کا لاطینی ترجمہ سب سے پہلے وینس سے ۱۴۹۷ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد اس کا لاطینی ایڈیشن، جس میں عربی کتاب کی اصل تصویریں بھی نہایت آب و تاب سے چھاپی گئی تھیں، ۱۵۴۱ء میں باسل میں طبع ہوا۔ باسل ایڈیشن کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس میں اصل عربی کتاب اور اس کا لاطینی ترجمہ دونوں ایک ہی جلد میں شامل تھے۔ یورپ میں اس کتاب کی مقبولیت انیسویں صدی کے آخر تک بھی باقی تھی۔ چنانچہ ایک فرانسیسی ڈاکٹر لی کارک نے ۱۸۸۱ء میں ”تصریف“ کو فرانسیسی زبان میں منتقل کیا اور دیباچے میں اس کتاب کو سرجری کا ایک نادر شاہکار قرار دیا۔ یورپ کے فضلاء نے ”تصریف“ کو محض اپنی زبانوں میں منتقل کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان میں سے بعض نے اس کتاب پر شرحیں بھی لکھی تھیں۔

(نامور مسلم سائنس دان)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے جو درست ہیں، ان کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں:

i- عبدالرحمان الناصر کس ملک کا حکمران تھا؟

- ا۔ اردن کا ب۔ مصر کا
ج۔ سپین کا د۔ سوڈان کا

ii- ابوالقاسم زہراوی کون تھا؟

- ا۔ ماہر تعمیرات ب۔ سائنس دان
ج۔ ماہر تعلیم د۔ ماہر قانون

iii- ابوالقاسم زہراوی کے آباؤ اجداد کہاں کے رہنے والے تھے؟

- ا۔ مصر ب۔ ایران
ج۔ عراق د۔ اندلس

iv- قرطبہ کی شاہی لائبریری میں کتنی کتابیں تھیں؟

- ا۔ ایک لاکھ
ب۔ ایک لاکھ سے زائد
ج۔ دو لاکھ سے زائد
د۔ تین لاکھ سے زائد

v- ابوالقاسم زہراوی نے اہل یورپ کو کس فن سے روشناس کرایا؟

- ا۔ فن تعمیرات سے
ب۔ فن دواسازی سے
ج۔ سرجری کے فن سے
د۔ فن کیمیاگری سے

2- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں:

i- ابوالقاسم زہراوی کی مشہور تصنیف کا نام کیا ہے؟

ii- ڈاکٹر لی کارک نے اس کتاب کا کس زبان میں ترجمہ کیا؟

iii- زہراوی کس یونیورسٹی میں زیر تعلیم رہے؟

iv- زہراوی کی مشہور تصنیف کن یونیورسٹیوں میں داخل درس رہی؟

v- زہراوی کے عہد میں مغرب کی عظیم ترین یونیورسٹی کون سی تھی؟

3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم لکھیں:

مہارت تامہ، جلیل القدر، چربہ، نادر، عمل جراحی۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اس طرح سے جملوں میں استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

تحقیق، علم الجراحات، امراض، ساخت، اکتفا۔

ادیب کی عزت

صبح کے وقت حضرت قمر نے بیس دفعہ ابالی ہوئی چائے کا پیالا تیار کیا اور بغیر چینی اور دودھ کے پی گئے۔ یہی ان کا ناشتہ تھا۔ دودھ اور چینی ان کے نزدیک ضروریات زندگی میں نہ تھیں۔ گھر میں گئے ضرور، کہ بیوی کو جگا کر پیسے مانگیں، پر اسے پھٹے میلے لحاف میں سوتے دیکھ کر جگانے کو جی نہ چاہا۔ سوچا شاید مارے سردی کے رات بھر نیند نہ آئی ہوگی، اس وقت جا کر آنکھ لگی ہے۔ کچی نیند جگا دینا مناسب نہ تھا۔ چپکے سے لوٹ گئے۔

چائے پی کر انھوں نے قلم دوات سنبھالی اور وہ کتاب لکھنے میں مچو ہو گئے۔ جوان کے خیال میں اس صدی کی بہترین تصنیف ہوگی جس کی اشاعت ان کو قعرِ گمنامی سے نکال کر شہرت اور ناموری کے آسمان پر پہنچا دے گی۔ آدھ گھنٹا کے بعد بیوی آنکھیں ملٹے ہوئے آکر بولی:

”چائے پی چکے؟“

قمر نے خوش ہو کر جواب دیا۔ ”ہاں پی چکا، بہت اچھی بنی تھی۔“

”مگر دودھ اور چینی کہاں سے لائے؟“

”آج کل سادہ چائے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ دودھ اور چینی ملانے سے چائے کا ذائقہ بگڑ جاتا ہے۔ ڈاکٹروں کی بھی یہی رائے

ہے۔ یورپ میں تو دودھ کا بالکل رواج نہیں۔ یہ تو ہمارے ہاں کے رئیسوں کی ایجاد ہے۔“

”نہ جانے آپ کو پھینکی چائے کیونکر اچھی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے جگا کیوں نہ لیا؟ پیسے رکھے تھے۔“ قمر نے جواب نہ دیا اور پھر لکھنے

لگے۔ جوانی ہی میں انھیں یہ بیماری لگ گئی تھی اور آج بیس سال سے وہ اسے پالے ہوئے تھے۔ اس بے نیازی کی شان سے جوادیوں

کی امتیازی صفت ہے، انھوں نے کسبِ معاش کے کسی اور ذریعہ کی طرف توجہ نہ کی۔ اس بیماری میں جسم گھل گیا۔ صحت گھل گئی اور

چالیس سال کی عمر ہی میں بڑھاپے نے آکر گھیر لیا مگر یہ مرض لاعلاج ہے۔ طلوعِ آفتاب سے آدھی رات تک یہ ادب کا پجاری

دنیا و مافیہا سے بے خبر فکرِ سخن میں غرق رہتا۔ اب انھیں یہ شبہ ہونے لگا تھا کہ میرے مضامین میں کوئی خوبی کوئی معنی ہی نہیں، اور یہ

انکشاف بدرجہ غایت ہمت شکن تھا۔ یہ عمر عزیز یوں تلف ہو گئی۔ یہ تسکین بھی نہیں کہ دنیا نے ناقدری کی ہو مگر ان کا کارنامہ حیات حقیر

نہیں۔ ضروریات زندگی گھٹتے گھٹتے زہد کی حدود کو بھی پار کر چکی تھیں۔ اگر کوئی تسکین تھی تو محض یہ کہ ان کی رفیقہ حیات ترک و ایثار

میں ان سے بھی بڑھی ہوئی تھی۔ سیکندہ اس تباہ حالی میں بھی مطمئن تھی۔ قمر کو دنیا سے شکایت ہو مگر سیکندہ ہمیشہ اس کی دلجوئی کرتی رہتی تھی۔

اپنے نصیبوں کو رونا تو دور کی بات تھی اس نے کبھی ماتھے پر بل بھی نہ آنے دیا۔ سیکندہ نے چائے کا پیالا سیٹھتے ہوئے کہا:

”تو جا کر گھٹنا آدھ گھٹنا کہیں گھوم پھر کیوں نہیں آتے۔ جب معلوم ہو گیا کہ جان دے کر کام کرنے سے بھی کوئی نتیجہ نہیں تو بیکار کیوں سرکھپاتے ہو؟“

قمر نے بغیر قلم اٹھائے ہوئے کہا! ”لکھنے میں کم از کم یہ تسلی تو ہوتی ہے کہ کچھ کر رہا ہوں۔ سیر کرنے میں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت ضائع ہو رہا ہے۔“

”یہ اتنے لکھے پڑھے آدمی ہر روز ہوا کھانے جاتے ہیں تو یہ کیا اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟“

”مگر ان میں زیادہ تر وہی لوگ ہوتے ہیں جن کو سیر کرنے سے مالی نقصان نہیں ہوتا۔ اکثر تو سرکاری ملازم ہوتے ہیں جن کو ماہوار تنخواہ مل جاتی ہے یا ایسے لوگ ہوتے ہیں جن کی عوام میں عزت ہے، میں تو مل کا مزدور ہوں۔ تم نے کبھی مزدوروں کو بھی ہوا کھاتے دیکھا ہے جنہیں کھانے کی کمی نہیں ان کو ہوا کی ضرورت ہے۔ جنہیں روٹیوں کے لالے ہیں وہ ہوا کیا کھائیں گے؟ پھر تندرستی اور لمبی عمر کی بھی ان ہی کو ضرورت ہے۔ اس بار کو سر پر کچھ دن اور اٹھائے رکھنے کی خواہش مجھے کیا ضرور ہے۔“

سکینہ نے مایوسی میں ڈوبی ہوئی باتیں سنیں تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور اندر چلی گئی۔ اس کا دل کہتا تھا، اس تپ کا پھل ایک دن انہیں ضرور ملے گا۔ دولت حاصل ہونہ ہو لیکن قمر صاحب یا اس کی حد تک جا پہنچے تھے، جہاں سے سمت مخالف میں طلوع ہونے والی امید کی سرفی بھی نہیں دکھائی دیتی۔

(۲)

ایک رئیس کے یہاں کوئی تقریب ہے۔ اس نے حضرت قمر کو بھی مدعو کیا ہے۔ آج ان کا دل خوشی کے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ناناچ رہا ہے۔ سارے دن وہ اسی تخیل میں غور ہے۔ راجا صاحب کن الفاظ میں ان کا خیر مقدم کریں گے اور وہ کن الفاظ میں ان کا جواب دیں گے۔ کن مضامین پر گفتگو ہوگی اور کن کن اصحاب سے ان کا تعارف کرایا جائے گا۔ سارا دن وہ انہی خیالات کے لطف اٹھاتے رہے۔ اس موقع کے لیے انھوں نے ایک نظم بھی تیار کی جس میں انھوں نے زندگی کو ایک باغ سے تشبیہ دی تھی۔ سراب ہستی ان کے زور طبع کے لیے زیادہ موزوں چیز تھی مگر وہ آج رئیسوں کے جذبات کو ٹھیس نہ لگا سکتے تھے۔

دوپہر ہی سے انھوں نے تیاریاں شروع کیں۔ حجامت بنائی۔ صابن سے نہائے۔ سر میں تیل ڈالا، دقت کپڑوں کی تھی۔ مدت گزری، جب انھوں نے ایک اچکن بنوائی تھی۔ اس کی حالت بھی ان کی تھی جیسے ذرا سی سردی یا گرمی سے انھیں زکام یا سردرد ہو جاتا تھا اسی طرح وہ اچکن بھی نازک مزاج تھی۔ اسے نکالا اور جھاڑ پونچھ کر رکھا۔

سکینہ نے کہا ”تم نے ناحق وہاں جانا منظور کیا، لکھ دیتے میری طبیعت ٹھیک نہیں۔ ان پھٹے حالوں جانا تو اور بھی بُرا ہے۔“

قمر نے فلاسفروں کی سی سنجیدگی سے کہا ”جنہیں خدا نے دل اور سمجھ دی ہے وہ آدمیوں کا لباس نہیں دیکھتے، ان کے منہ دیکھتے ہیں۔ آخر کچھ بات تو ہے کہ راجا صاحب نے مدعو کیا ہے۔ میں کوئی عہدے دار نہیں، زمیندار نہیں، جاگیردار نہیں، ٹھیکہ دار نہیں، معمولی ایک شاعر ہوں۔ شاعر کی قیمت اس کی نظمیں ہوتی ہیں۔ اس نقطہ نگاہ سے مجھے کسی کے سامنے نادام ہونے کی ضرورت نہیں۔“

سکینہ ان کی سادگی پر ترس کھا کر بولی ”تم خیالات کی دنیا میں رہتے رہتے حقیقی دنیا سے بالکل بے گانہ ہو گئے ہو۔ میں کہتی ہوں راجا صاحب کے یہاں لوگوں کی نگاہ سب سے زیادہ کپڑوں ہی پر پڑے گی۔ سادگی ضرور اچھی چیز ہے لیکن اس کے معنی یہ تو نہیں کہ آدمی بیوقوف ہی بن جائے۔“

قمر کو اس دلیل میں کچھ جان نظر آئی۔ اہل نظر کی طرح انھیں اپنی غلطیوں کے اعتراف میں پس و پیش نہ ہوتا تھا۔ بولے:

”میرا خیال ہے چراغ جل جانے کے بعد جاؤں۔“

”میں تو کہتی ہوں جاؤ ہی کیوں؟“

”اب تم کو کیسے سمجھاؤں۔ ہر شخص کے دل میں اعزاز و احترام کی بھوک ہوتی ہے۔ تم پوچھو گی یہ بھوک کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ ہماری روح کے ارتقا کی ایک منزل ہے۔ ہم اس عظیم الشان طاقت کا لطیف حصہ ہیں جو ساری دنیا میں حاضر و ناظر ہے۔ جزو میں کل کی خوبیاں ہونا لازمی امر ہے۔ اس لیے جاہ و رفعت علم و فضل کی جانب ہمارا فطری میلان ہے۔ میں اس ہوس کو معیوب نہیں سمجھتا۔ ہاں! چونکہ دل میں ضعف ہے۔ اہل دنیا کی حرف گیر یوں کا خیال قدم قدم پر دامن گیر ہو جاتا ہے۔“

سکینہ نے گلا چھڑانے کے لیے کہا ”اچھا بھئی جاؤ۔ میں تم سے بحث نہیں کرتی لیکن کل کے لیے کوئی سبیل سوچتے جاؤ کیونکہ میرے پاس صرف ایک آنہ اور رہ گیا ہے۔ جن سے قرض مل سکتا تھا ان سے لے چکی اور جس سے لیا اُسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ مجھے تو اب اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔“

قمر نے ایک لمحہ کے بعد کہا ”دو ایک اخباروں سے روپیہ آنے والا ہے۔ شاید کل تک آجائے اور اگر فاقہ کشی ہی کرنی پڑے تو کیا فکر ہے۔ ہمارا فرض کام کرنا ہے۔ ہم کام کرتے ہیں اور دل و جان سے کرتے ہیں۔ اگر اس کے باوجود فاقہ کرنا پڑے، تو میرا قصور نہیں۔ مر ہی تو جاؤں گا۔ ہمارے جیسے لاکھوں آدمی آئے دن مرتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی کام بند نہیں ہوتا۔ تم ہی کہو میں جو کچھ کرتا ہوں، اس سے زیادہ میرے امکان میں کیا ہے؟ ساری دنیا میٹھی نیند سوتی ہے اور میں قلم لیے بیٹھا رہتا ہوں۔ لوگ سیر و تفریح کرتے ہیں، کھیلتے کودتے ہیں۔ میرے لیے سب کچھ حرام ہے۔ یہاں تک کہ مہینوں سے ہنسنے کی نوبت نہیں آئی۔ عید کے دن بھی میں نے تعطیل نہیں منائی۔ بیمار ہوتا ہوں، جب بھی لکھتا ہوں۔ سوچو تم بیمار تھیں اور میرے پاس حکیم کے پاس جانے کے لیے بھی وقت نہ تھا۔ اگر دنیا نہیں قدر کرتی نہ کرے۔ اس میں دنیا ہی کا نقصان ہے میرا تو کوئی نقصان نہیں۔ چراغ کا کام جلنا ہے۔ اس کی روشنی پھیلتی ہے یا اس کے سامنے کوئی دیوار ہے، اسے اس سے مطلب نہیں۔ میرا بھی ایسا کون دوست، شناسا یا رشتہ دار ہے جس کا میں شرمندہ احسان نہیں۔ یہاں تک کہ اب گھر سے نکلتے بھی شرم آتی ہے۔ اطمینان صرف اتنا ہے کہ لوگ مجھے بدینت تصور نہیں کرتے۔ خواہ وہ میری کچھ زیادہ امداد نہ کر سکیں مگر انھیں مجھ سے ہمدردی ہے۔ میری خوشی کے لیے اسی قدر کافی ہے کہ آج مجھے ایک رئیس نے بلایا ہے۔“

پھر معائن پر نشہ سا چھا گیا۔ غرور سے بولے:

”نہیں اب رات کو نہ جاؤں گا۔ جسے راجا لوگ مدعو کریں، وہ ایسا ویسا آدمی نہیں ہو سکتا۔ راجا صاحب معمولی رئیس نہیں۔“

اگر اب بھی کوئی مجھے معمولی آدمی سمجھے، تو اس کی عقل کا فتور ہے۔“

(۳)

شام کے وقت حضرت قمر اپنی پھٹی پڑنی اچکن، سڑے ہوئے جوتے اور بے تکی سی ٹوپی پہنے گھر سے نکلے تو گنوار اچکے سے معلوم ہوتے تھے۔ ڈیل ڈول اور چہرے مہرے کے آدمی ہوتے تو اس ٹھاٹھ میں بھی ایک شان ہوتی۔ فریبی بجائے خود با رعب شے ہے مگر ادبی خدمت اور فریبی میں خدا واسطے کا بیر ہے۔ اگر کوئی ادیب مونا تازہ ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں سوز نہیں، لوچ نہیں، دل نہیں۔ پھر بھی اکڑے جاتے تھے۔ ایک ایک عضو سے غرور نکلتا تھا۔

یوں گھر سے نکل کر وہ دکان داروں سے آنکھ بچا کر نکل جاتے تھے مگر آج وہ گردن اٹھائے ان کے سامنے سے جا رہے تھے۔ آج وہ ان کے تقاضوں کا دندان شکن جواب دینے کو تیار تھے مگر شام کا وقت تھا ہر ایک دکان پر خریداروں کا ہجوم تھا۔ کوئی ان کی طرف نہیں دیکھتا۔ جس رقم کو وہ بہت زیادہ سمجھتے تھے، وہ دکان داروں کی نگاہوں میں معمولی تھی۔ کم از کم ایسی نہ تھی جس کی خاطر وہ کسی کی عزت اتار کر رکھ دیں۔ حضرت قمر نے ایک مرتبہ سارے بازار کا چکر لگایا، پر جی نہ بھرا۔ تب دوسرا چکر لگایا اس سے بھی کچھ نہ بنا۔ تب وہ خود حافظ صاحب کی دکان پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ حافظ صاحب باطنی کام کرتے تھے۔ قمر کو دیکھ کر بولے ”واہ حضرت، ابھی تک چھاتے کے دام نہیں ملے۔ ایسے سو پچاس گاہک مل جائیں تو دیوالہ نکل جائے۔ اب تو دن بہت ہو گئے۔“

حضرت قمر کی باچھیں کھل گئیں۔ دل کی مراد پوری ہوئی۔ بولے ”میں بھولا نہیں ہوں حافظ صاحب، ان دنوں کام کی اس قدر زیادتی رہی کہ گھر سے نکلنا دشوار تھا۔ روپیا تو ہاتھ نہیں آتا پر آپ کی دُعا سے قدر شناسوں کی کمی نہیں۔ دو چار آدمی گھیرے ہی رہتے ہیں۔ زندگی وبال ہے۔ اس وقت بھی راجا صاحب اجی وہی جو کٹڑ والے بنگلے میں رہتے ہیں ان ہی کے یہاں جا رہا ہوں، روز کوئی نہ کوئی ایسا ہی موقع آتا رہتا ہے۔“

حافظ صاحب مرعوب ہو گئے..... ”اچھا آپ راجا صاحب کے ہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ ٹھیک ہے۔ آپ جیسے باکمالوں کی قدر رئیس ہی کر سکتے ہیں اور کون کرے گا۔ اگر کوئی موقع ہاتھ آئے تو غریب کو بھول نہ جائیے گا۔ راجا صاحب کی اگر ادھر نگاہ ہو جائے تو پھر کیا پوچھنا، ایک پورا باسط خانہ تو ان ہی کے لیے درکار ہے۔ ڈھائی تین لاکھ سالانہ کی آمدنی ہے۔“

قمر صاحب کو ڈھائی تین لاکھ کی آمدنی حقیر سی معلوم ہوئی۔ زبانی جمع خرچ ہے تو میں لاکھ کہنے میں کیا حرج ہے؟ بولے ”ان کی آمدنی دس لاکھ سے کم نہیں۔ ایک صاحب کا اندازہ تو میں لاکھ کا ہے۔ مکان ہے، دکانیں ہیں، ٹھیکہ ہے، امانتی روپے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سرکار بہادر کی نگاہ ہے۔“

حافظ نے بڑے عجز سے کہا ”یہ دکان آپ کی ہے۔ جناب بس اتنی ہی عرض ہے۔ اے مرادی، ذرا دو پیسے کے اچھے پان تو بھولا۔ آپ کے لیے۔ آئیے دو منٹ بیٹھیے، کوئی چیز دکھاؤں گا۔ آپ سے تو گھر کا معاملہ ہے۔“

قمر نے پان کھاتے ہوئے کہا ”اس وقت تو معاف رکھیے۔ وہاں دیر ہوگی، پھر کبھی حاضر ہوں گا۔“

یہاں سے اٹھ کر وہ ایک کپڑے والے کی دکان پر رُکے۔ انھیں دیکھ کر آنکھیں اٹھائیں۔ بے چارہ ان کے نام کو رو بیٹھا تھا۔ سوچتا تھا شاید کہیں چلے گئے۔ سمجھا روپے دینے آئے ہیں۔ بولا:

”بھائی، آپ نے تو بہت دن سے درشن ہی نہیں دیے۔ کئی بار رقعہ بھیجا، مگر آدمی کو آپ کے مکان کا پتہ نہ تھا۔ منشی جی ذرا دیکھو تو آپ کے نام کیا نکلتا ہے؟“

قمر کی روح تقاضوں سے کانپتی تھی، لیکن آج اس طرح بے فکر کھڑے تھے جیسے کوئی اپنی خود پہن لیا ہو۔ جس پر کوئی ہتھیار کارگر نہیں ہوتا۔ بولے ”ذرا راجا صاحب کے یہاں ہواؤں تو بے فکر ہو کر بیٹھوں۔ اس وقت نہیں جلدی میں ہوں۔“

راجا صاحب پر کئی سو روپے نکلتے تھے۔ پھر بھی ان کا دامن نہ چھوڑتا تھا۔ ایک کے تین وصول کرتا۔ اس نے قمر کو بھی اس جماعت میں رکھ لیا جس کا پیشہ ریکسوں کو لوٹنا ہے۔ بولا:

”پان تو کھاتے جائیے جناب! راجا صاحب ایک دن کے ہیں، ہم تو بارہ مہینوں کے ہیں۔ کچھ کپڑا درکار ہو تو لے جائیے، عید آ رہی ہے۔ موقع ملے تو راجا صاحب کے خزانچی سے کہنا ”پرانا حساب بہت دنوں سے پڑا ہے، اب تو صاف ہو جائے۔ اب ہم ایسا کون سا نفع لے لیتے ہیں کہ دو دو سال تک حساب ہی نہ ہو۔“

قمر بولے ”اس وقت پان وان رہنے دو بھائی۔ دیر ہو جائے گی۔ جب انھیں مجھ سے ملنے کا اس قدر اشتیاق ہے اور میرا اتنا ادب کرتے ہیں تو میرا بھی فرض ہے کہ انھیں تکلیف نہ ہونے دوں۔ ہم تو قدر دانی چاہتے ہیں، دولت کے بھوکے نہیں۔ کوئی ہمیں چاہے تو ہم اس کے غلام ہیں۔ کسی کو ریاست کا غرور ہے تو ہمیں بھی اپنے علم و کمال کا غرور ہے۔“

(۴)

حضرت قمر راجا صاحب کے بنگلے کے سامنے پہنچے تو دیے جل چکے تھے۔ امیروں اور ریکسوں کی موٹریں کھڑی تھیں۔ دروازے پر وردی پوش دربان کھڑے تھے۔ ایک صاحب مہمانوں کا استقبال کر رہے تھے۔ قمر کو دیکھ کر وہ جھکے، پھر انھیں سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولے ”آپ کے پاس کارڈ ہے؟“

قمر صاحب کی جیب میں کارڈ تھا، مگر اس مطالبے پر انھیں غصہ آ گیا۔ انھی سے کیوں کارڈ مانگا گیا؟ اوروں سے تو کوئی پوچھتا نہیں۔ بولے:

”میرے پاس تو کوئی کارڈ نہیں، اگر آپ دوسروں سے کارڈ مانگتے تو میں بھی دکھا دیتا۔ ورنہ میں اسے اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ آپ راجا صاحب سے کہہ دیجیے گا، قمر آیا تھا، لوٹ گیا۔“

وہ بولے ”نہیں نہیں جناب، اندر چلیے، آپ سے تعارف نہ تھا۔ معاف فرمائیے۔ آپ ہی جیسے اصحاب سے تو محفل کی رونق ہے۔ خدا نے آپ کو وہ کمال عطا فرمایا ہے کہ سبحان اللہ۔“

اس شخص نے قمر کو کبھی نہ دیکھا تھا مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہر ایک مصنف، ہر ایک شاعر کے متعلق کہا جاسکتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ

کوئی ادیب اس داد سے مستثنیٰ نہیں۔

قمر اندر پہنچے تو دیکھا کہ بارہ دری کے سامنے وسیع اور آراستہ احاطے میں بجلی کے لیپ روشن ہیں۔ وسط میں ایک حوض ہے اور حوض میں سنگ مرمر کی ایک پری۔ پری کے سر پر فوارہ۔ فوارے کی پھواریں رنگین لیپوں سے رنگین ہو کر ایسی معلوم ہوتی تھیں، جیسے قوس قزح پکھل کر ریں رہا ہو۔ حوض کے چاروں طرف میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر سفید پوش، ان پر خوب صورت گلہ سے.....

قمر کو دیکھتے ہی راجا صاحب نے خیر مقدم کیا ”آئیے آئیے، اب کے آپ کی نظم دیکھ کر تو دل خوش ہو گیا۔ مجھے معلوم نہ تھا، اس شہر میں آپ جیسے رتن بھی چھپے ہوئے ہیں۔“

پھر بیٹھے ہوئے احباب سے ان کا تعارف کرانے لگے ”آپ نے حضرت قمر کا نام تو سنا ہوگا؟ وہ آپ ہی ہیں۔ کیا شیرینی ہے، کیا جدت ہے، کیا تخیل ہے، کیا روانی ہے، کیا ندرت ہے کہ واہ! میرا دل تو آپ کی چیزیں پڑھ کر ناپنے لگتا ہے۔“

ایک صاحب نے جو انگریزی سوٹ میں تھے، قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا وہ چڑیا گھر کا کوئی جانور ہو اور بولے ”آپ نے انگریزی شاعری کا بھی مطالعہ کیا۔ بائرن، شیلے، ٹینیسن وغیرہ؟“

قمر نے بے اعتنائی سے جواب دیا ”جی ہاں تھوڑا بہت دیکھا ہے۔“

”آپ ان استادان فن کی کتابوں میں سے کسی کا ترجمہ کر دیں تو آپ اپنی زبان کی بڑی خدمت کریں۔“

قمر اپنے آپ کو بائرن، شیلے سے جو بھر کم نہ سمجھتے تھے۔ بولے ”ہمارے یہاں روحانیت کا ابھی اتنا فقدان نہیں ہوا کہ مغربی شاعروں سے بھیک مانگیں۔ میرا خیال ہے کم از کم اس مضمون میں ہم اب بھی مغرب کو بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔“

انگریزی پوش صاحب نے قمر کو پاگل سمجھا۔ راجا صاحب نے قمر کو ایسی نگاہوں سے دیکھا گویا کہ رہے ہوں ذرا موقع محل دیکھ کر باتیں کرو اور بولے ”انگریزی لٹریچر کا کیا کہنا۔ شاعری میں تو اس کا جواب نہیں ہے۔“

انگریزی پوش ”ہمارے شاعروں کو ابھی تک اتنا بھی معلوم نہیں کہ شاعری کے کیا معنی ہیں وہ ابھی تک ہجر و وصال کو شاعری کا منہائے مقصود سمجھے بیٹھے ہیں۔“

قمر نے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا ”میرا خیال ہے آپ نے ہندوستانی شعر کا کلام ابھی تک دیکھا ہی نہیں اور اگر دیکھا ہے تو سمجھا نہیں۔“

راجا صاحب نے قمر کا منہ بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بولے ”آپ کے مضامین انگریزی اخبارات میں چھپتے ہیں اور لوگ انھیں بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔“

اس کے معنی یہ ہیں کہ اب آپ زیادہ نہ ہنسیے۔ ایک اور صاحب آئے۔ راجا صاحب نے تپاک سے ان کا بھی استقبال کیا۔ ”آئیے ڈاکٹر، مزاج تو اچھے ہیں؟“

راجا صاحب نے قمر کا تعاف کرایا ”آپ حضرت قمر شاعر ہیں۔“
 ڈاکٹر صاحب نے خاص انداز سے کہا ”اچھا! آپ شاعر ہیں۔“ اور بغیر کچھ کہے سنے آگے بڑھ گئے۔
 یہ تماشائی مرتبہ ہوا اور ہر بار قمر کو یہی داد ملی ”اچھا آپ شاعر ہیں۔“

یہ الفاظ ہر مرتبہ قمر کے دل پر نیا صدمہ پہنچاتے تھے۔ ان کا باطنی مفہوم قمر سے چھپا نہ تھا۔ عام فہم الفاظ میں یہ مطلب تھا ”تم اپنے خیالی پلاؤ پکاتے ہو پکاؤ۔ یہاں تمہارا کیا کام؟ تمہارا اتنا حوصلہ کہ اس محفل میں چلے آؤ؟“

قمر اپنے اوپر جھنجھٹا رہے تھے۔ دعوتی کارڈ پا کر وہ پھولے نہ سمائے تھے لیکن یہاں آ کر ان کی جس قدر تذلیل ہوئی اس کو دیکھ کر اپنا اطمینان کا جھونپڑا جنت سے کم نہ تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو طعن کی۔ ”تمہارے جیسے عزت کے ہوس مندوں کی یہی سزا ہے۔ اب تو آنکھیں کھلیں کہ تم کتنی عزت کے مستحق ہو۔ تم خود اس غرض مند دنیا میں کسی کے کام نہیں آ سکتے۔ وکیل تمہارا احترام کیوں کریں؟ تم ان کے موکل نہیں ہو سکتے۔ ڈاکٹر اور حکیم تمہاری طرف کیوں دیکھیں؟ انہیں بغیر فیس کے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ تم لکھنے کے لیے بنے ہو۔ لکھتے جاؤ۔ اس دنیا میں تمہارا اور کوئی مصرف نہیں۔“

یکا یک لوگوں میں ہل چل مچ گئی۔ آج کا جلسہ جن صاحب کے اعزاز میں تھا وہ یورپ سے کوئی بڑی ڈگری لے کر آئے تھے۔

راجا صاحب نے لپک کر ان سے ہاتھ ملایا اور قمر سے بولے ”آپ اپنی نظم تولائے ہوں گے؟“

قمر نے جواب دیا ”میں نے کوئی نظم تیار نہیں کی۔“

”بیچ اب تو آپ نے غضب ہی کر ڈالا۔ ارے بھلے آدمی تو اب ہی بیٹھ کر کوئی چیز لکھ لو، دو چار شعر ہی ہو جائیں۔ ایسے موقع پر نظم کا پڑھا جانا لازمی ہے۔“

”میں اس قدر جلد کوئی چیز نہیں لکھ سکتا۔“

”میں نے بیکار اتنے آدمیوں سے آپ کا تعارف کرایا۔“

”بالکل بیکار۔“

”ارے بھائی جان، کسی پرانے شاعر ہی کی کوئی چیز سنا دیجیے۔ یہاں کون جانتا ہے۔“ جی نہیں، معاف فرمائیے۔ میں بھاٹ یا میراثی نہیں ہوں۔“ یہ کہتے کہتے حضرت قمر وہاں سے چل دیے۔

گھر پہنچے تو ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ سیکینہ نے خوش ہو کر پوچھا۔

”اتنی جلدی کیونکر چلے آئے؟“

”میری وہاں ضرورت نہ تھی۔“

”چہرہ کھلا ہوا ہے، خوب عزت افزائی ہوئی ہوگی؟“

”ایسی کہ خواب میں بھی امید نہ تھی۔“

”خوب خوش ہو رہے ہو؟“

”اس لیے، کہ آج مجھے ہمیشہ کے لیے سبق مل گیا۔ میں چراغ ہوں اور جلنے کے لیے ہوں۔ میں یہ بات بھول گیا تھا۔ مگر خدا نے

مجھے زیادہ بھٹکنے نہ دیا۔ میرا یہ جھوٹا ہی میرے لیے جنت ہے۔ میں نے آج سمجھ لیا، کہ ادبی خدمت پوری عبادت ہے۔“

(آخری تھفہ)

مشق

1- درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔

i- حضرت قمر نے چائے کا پیالا تیار کیا۔

(الف) بیس دفعہ اُبالی ہوئی۔ (ب) تیس دفعہ اُبالی ہوئی۔

(ج) چالیس دفعہ اُبالی ہوئی۔ (د) پچاس دفعہ اُبالی ہوئی۔

ii- حضرت قمر کی رائے میں چائے میں دودھ ملانا

(الف) ہمارے رئیسوں کی ایجاد ہے۔ (ب) ہمارے غریبوں کی ایجاد ہے۔

(ج) ہمارے حکمرانوں کی ایجاد ہے۔ (د) ہماری عوام کی ایجاد ہے۔

iii- حضرت قمر کی بیوی کا نام تھا۔

(الف) رضیہ (ب) رفیعہ (ج) نصیبہ (د) سیکنہ

iv- قمر صاحب کے پاس روپے کہاں سے آنے والے تھے؟

(الف) اخباروں سے (ب) دکان داروں سے (ج) رئیسوں سے (د) شاعروں سے

2- مختصر جواب لکھیں۔

i- قمر صاحب نے اپنے ہنسنے کے بارے میں کیا کہا؟

ii- قمر صاحب رئیس کے ہاں کیسے کپڑے پہن کر گئے؟

iii- قمر صاحب رئیس کے ہاں جاتے وقت کن لوگوں سے ملے؟

iv- قمر صاحب نے کارڈ مانگنے پر کیا کہا؟

v- قمر صاحب نے انگریزی ادب کے بارے میں کیا کہا؟

vi- قمر صاحب نے لکھنے پڑھنے کے کام کو عبادت کیوں کہا؟

vii- افسانہ نگار نے اس افسانے کا نام ”ادیب کی عزت“ کیوں رکھا؟

3- پریم چند کے افسانے ”ادیب کی عزت“ کا خلاصہ لکھیے۔

اوور کوٹ

جنوری کی ایک شام کو ایک خوش پوش نوجوان ڈیوس روڈ سے گزر کر مال روڈ پر پہنچا اور چیرنگ کر اس لے کا رخ کر کے خراماں خراماں ہٹوں پر چلنے لگا۔ یہ نوجوان اپنی تراش خراش سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔ چمکتے ہوئے بال، باریک باریک مونچھیں گویا سرمے کی سلائی سے بنائی گئی ہوں، بادامی رنگ کا اوور کوٹ پہنے ہوئے جس کے کاج میں شربتی رنگ کے گلاب کا ایک آدھ کھلا پھول اٹکا ہوا، سر پر سبز فلیٹ ہیٹ ایک خاص انداز سے ٹیڑھی رکھی ہوئی، سفید سلک کا گلوبند گلے کے گرد لپٹا ہوا، ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں، دوسرے میں بید کی ایک چھوٹی چھڑی پکڑے ہوئے جسے کبھی کبھی وہ مزے میں آ کے گھمانے لگتا تھا۔

یہ ہفتے کی شام تھی۔ بھر پور جاڑے کا زمانہ۔ سرد اور تند ہوا کسی تیز دھات کی طرح جسم پر آ کے لگتی تھی مگر اس نوجوان پر اس کا کچھ اثر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ لوگ خود کو گرم کرنے کے لیے تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے مگر اسے اس کی ضرورت نہ تھی جیسے اس کو کڑا تے جاڑے میں اسے ٹھنڈے میں بڑا مزا آ رہا ہو۔

اس کی چال ڈھال سے ایسا باتکین نکلتا تھا کہ تانگے والے دور ہی سے دیکھ کر سر پٹ گھوڑا دوڑاتے ہوئے اس کی طرف لپکتے مگر وہ چھڑی کے اشارے سے ”نہیں“ کر دیتا۔ ایک خالی ٹیکسی بھی اسے دیکھ کر رکی مگر اس نے ”نو ٹھینک یو“ کہہ کر اسے بھی ٹال دیا۔

جیسے جیسے وہ مال کے زیادہ بارونق حصے کی طرف پہنچتا جاتا تھا اس کی چونچالی بڑھتی ہی جاتی تھی۔ وہ منہ سے سیٹی بجا کے رقص کی ایک دھن نکالنے لگا۔ ایک دفعہ جب آس پاس کوئی نہیں تھا تو یک بارگی کچھ ایسا جوش آیا کہ اس نے دوڑ کر جھوٹ موٹ بال دینے کی کوشش کی گویا کرکٹ کا میچ ہو رہا ہے۔

راستے میں وہ سڑک آئی جو لارنس گارڈن کی طرف جاتی تھی مگر اس وقت شام کے دھندلکے اور سخت کھرے میں اس باغ پر کچھ ایسی اداسی برس رہی تھی کہ اس نے ادھر کا رخ نہ کیا اور سیدھا چیرنگ کر اس کی طرف چلتا رہا۔

اس نے اپنا رومال نکالا جسے جیب میں رکھنے کے بجائے اس نے کوٹ کی بائیں آستین میں اڑس رکھا تھا اور ہلکے ہلکے چہرے پر پھیرا تا کہ کچھ کچھ گرمی ہو تو اتر جائے۔ پاس ہی گھاس کے ایک ٹکڑے پر کچھ بچے ایک بڑی سی گیند سے کھیل رہے تھے۔ وہ بڑی دلچسپی سے ان کا کھیل دیکھنے لگا۔ بچے کچھ دیر تک اس کی پروا کیے بغیر کھیل میں مصروف رہے مگر جب وہ برابر تکے ہی چلا گیا تو وہ رفتہ رفتہ

۱ Chairing Cross پنجاب اسمبلی ہال کے سامنے لاہور کا ایک مشہور چوک۔

۲ Lawrence Garden لاہور کا ایک معروف باغ جسے آج کل ”باغ جناح“ کہتے ہیں۔

شرمانے سے لگے اور پھر اچانک گیند سنبھال کر، ہنستے ہوئے اور ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے گھاس کے اس ٹکڑے ہی سے چلے گئے۔

نوجوان کی نظر سینٹ کی ایک خالی بیچ پر پڑی اور وہ اس پر آ کے بیٹھ گیا۔ اس وقت شام کے اندھیرے کے ساتھ ساتھ سردی اور بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی یہ شدت ناخوشگوار نہ تھی۔

مال روڈ پر موٹروں اور بائیکلوں کا تانتا بندھا ہوا تو تھا ہی پڑی پر چلنے والوں کی بھی کثرت تھی۔ علاوہ ازیں سڑک کی دورویہ دکانوں میں خرید و فروخت کا بازار بھی گرم تھا۔ جن کم نصیبوں کو نہ تفریح طبع کی اصطاعت تھی نہ خرید و فروخت کی وہ دور ہی سے کھڑے کھڑے ان تفریح گاہوں اور دکانوں کی رنگارنگ روشنیوں سے جی بہلا رہے تھے۔

نوجوان سینٹ کی بیچ پر بیٹھا اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے زن و مرد کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ان کے چہروں سے کہیں زیادہ ان کے لباس پر پڑتی تھی۔ ان میں ہر وضع اور ہر قماش کے لوگ تھے۔ بڑے بڑے تاجر، سرکاری افسر، لیڈر، فن کار، کالجوں کے طلبہ اور طالبات، نرسیں، اخباروں کے نمائندے، دفتروں کے بابوزیادہ تر لوگ اور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ہر قسم کے اوور کوٹ، قراقلی کے بیش قیمت اوور کوٹ سے لے کر خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوور کوٹ تک جنھیں نیلام میں خریدا گیا تھا۔

نوجوان کا اپنا اوور کوٹ تھا تو خاصا پرانا مگر اس کا کپڑا خوب بڑھیا تھا۔ پھر وہ سلا ہوا بھی کسی ماہر درزی کا تھا۔ اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کی بہت دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ کالر خوب جما ہوا تھا۔ ہاتھوں کی کریزیں بڑی نمایاں، سلوٹ کہیں نام کو نہیں، بٹن سینگ کے بڑے بڑے چمکتے ہوئے۔ نوجوان اس میں بہت مگن ہوتا تھا۔

ایک لڑکا پان بیڑی سگریٹ کا صندوقچہ گلے میں ڈالے سامنے سے گزرا۔ نوجوان نے آواز دی۔

”پان والا۔“

”جناب“

”دس کا چینیج ہے؟“

”ہے تو نہیں۔ لا دوں گا۔ کیا لیں گے آپ؟“

”نوٹ لے کے بھاگ گیا تو؟“

”اجی واہ! کوئی چور اچکا ہوں جو بھاگ جاؤں گا۔ اعتبار نہ ہو تو میرے ساتھ چلیے۔ لیں گے کیا آپ؟“

”نہیں نہیں ہم خود چینیج لائیں گے۔ لویہ کنی نکل آئی۔ ایک سگریٹ دے دو اور چلے جاؤ۔“

لڑکے کے جانے کے بعد وہ سگریٹ کے کش لگانے لگا۔

ایک چھوٹی سی سفید رنگ کی بلی سردی میں ٹھنھری ہوئی بیچ کے نیچے اس کے قدموں کے پاس آ کر میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ اس

نے پکارا تو اچھل کر بچ پر آ چڑھی۔ اس نے پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا ”پورل سل“۔ اب سات بج چکے تھے اور وہ مال کی پٹری پر پھر پہلے کی طرح مڑگشت کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ایک ریسٹوران میں آرکسٹر^۱ بج رہا تھا۔ اندر سے کہیں زیادہ باہر لوگوں کا جھوم تھا۔ ان میں زیادہ تر موٹروں کے ڈرائیور، کوچوان، پھل بیچنے والے جو اپنا مال بیچ کے خالی نوکرے لیے کھڑے تھے، کچھ راہ گیر جو چلتے چلتے ٹھہر گئے تھے، کچھ مزدوری پیشہ لوگ تھے اور کچھ گداگر۔ نو جوان پل بھر کے لیے رکا اور پھر آگے بڑھ گیا۔

راستے میں ایک چھوٹا سا بک سٹال پڑا۔ نو جوان یہاں بھی رکا۔ کئی تازہ رسالوں کے ورق الٹے۔ رسالہ جہاں سے اٹھاتا بڑی احتیاط سے وہیں رکھ دیتا۔ اور آگے بڑھتا تو قالینوں کی ایک دکان نے اس کی توجہ کو جذب کیا۔ مالک دکان نے، جو ایک لمبا سا چنڈ پہنے اور سر پر گلاہ رکھے تھا، گرم جوشی سے اس کی آؤ بھگت کی۔

”ذرا یہ ایرانی قالین دیکھنا چاہتا ہوں۔ اتار بیٹے نہیں، یہیں دیکھ لوں گا۔ کیا قیمت ہے اس کی؟“

”چودہ سو تیس روپے۔“

”نو جوان نے اپنی ہنٹوں کو سکیزا جس کا مطلب تھا ”اوہو اتنی!“

دکاندار نے کہا ”آپ پسند کر لیجیے۔ ہم جتنی بھی رعایت کر سکتے ہیں کر دیں گے۔“

”شکریہ، لیکن اس وقت تو میں صرف ایک نظر دیکھنے آیا ہوں۔“

”شوق سے دیکھیے۔ آپ ہی کی دکان ہے۔“

دو تین منٹ کے بعد اس دکان سے بھی نکل آیا۔ اس کے اوور کوٹ کے کاج میں شرتی رنگ کے گلاب کا جو آدھ کھلا پھول اٹکا ہوا تھا۔ وہ اس وقت کاج سے کچھ زیادہ باہر نکل آیا تھا۔ جب وہ اس کو ٹھیک کر رہا تھا تو اس کے ہونٹوں پر ایک خفیف اور پراسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی اور اس نے پھر اپنی مڑگشت شروع کر دی۔

اب وہ ہائی کورٹ کی عمارتوں کے سامنے سے گزر رہا تھا۔ اتنا کچھ چل لینے کے بعد بھی اس کی طبیعت کی چونچالی میں کچھ فرق نہیں آیا تھا، نہ تھکان محسوس ہوئی تھی نہ اکتاہٹ۔ یہاں پٹری پر چلنے والوں کی ٹولیاں کچھ چھٹ سی گئی تھیں اور ان میں کافی فاصلہ رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنی بید کی چھڑی کو ایک انگلی پر گھمانے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی اور چھڑی زمین پر گر پڑی۔ ”اوسوری“^۲ کہ کر زمین پر جھکا اور چھڑی کو اٹھا لیا۔

نو جوان نے شام سے اب تک اپنی مڑگشت کے دوران میں جتنی انسانی شکلیں دیکھی تھیں ان میں سے کسی نے بھی اس کی توجہ کو اپنی طرف منعطف نہیں کیا تھا۔ فی الحقیقت ان میں کوئی جاذبیت تھی ہی نہیں یا پھر وہ اپنے حال میں ایسا مست تھا کہ کسی دوسرے کے اسے سروکار ہی نہ تھا مگر ابھی اس نے آدھی ہی سڑک پار کی ہوگی کہ اینٹوں سے بھری ہوئی ایک لاری پیچھے سے بگولے کی طرح آئی اور

اسے روندتی ہوئی میکوڈروڈ^۱ کی طرف نکل گئی۔ لاری کے ڈرائیور نے نوجوان کی چیخ سن کر پل بھر کے لیے گاڑی کی رفتار کم کی۔ وہ سمجھ گیا کہ کوئی لاری کی لپیٹ میں آ گیا اور وہ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لاری کو لے بھاگا۔ دو تین راہ گیر جو اس حادثے کو دیکھ رہے تھے شور مچانے لگے ”نمبر دیکھو، نمبر دیکھو۔“ مگر لاری ہوا ہو چکی تھی۔

اتنے میں کئی اور لوگ جمع ہو گئے۔ ٹریفک کا ایک انسپکٹر جو موٹر سائیکل پر جا رہا تھا رک گیا۔ نوجوان کی دونوں ٹانگیں بالکل کچل گئی تھیں۔ بہت سا خون نکل چکا تھا اور وہ سسک رہا تھا۔ فوراً ایک کار کو روکا گیا اور اسے جیسے تیسے اس میں ڈال کر ہسپتال روانہ کر دیا گیا جس وقت وہ ہسپتال پہنچا تو اس میں ابھی رقی بھر جان باقی تھی۔ اس ہسپتال کے شعبہ حادثات میں اسسٹنٹ سرجن^۲ مسٹر خان اور دو نوجوان نرسیں مس شہناز اور مس گل ڈیوٹی پر تھیں۔ جس وقت اسے سڑ پچر^۳ پر ڈال کے آپریشن روم^۴ میں لے جایا جا رہا تھا تو ان نرسیں کی نظر اس پر پڑی۔ اس کا بادامی رنگ کا اور کوٹ ابھی تک اس کے جسم پر تھا اور سفید سلک کا مفلر^۵ گلے میں لپٹا ہوا تھا۔ اس کے کپڑوں پر جابجا خون کے بڑے بڑے دھبے تھے۔ کسی نے انہیں دردمندی اس کی سبزیلیٹ ہیٹ اٹھا کے اس کے سینے پر رکھ دی تھی تاکہ کوئی اڑانہ لے جائے۔

شہناز نے گل سے کہا ”کسی بھلے گھر کا معلوم ہوتا ہے بے چارہ۔“

گل دبی آواز میں بولی ”خوب بن ٹھن کے نکلا تھا بے چارہ۔“

”ڈرائیور پکڑا گیا یا نہیں؟“

”نہیں، بھاگ گیا۔“

”کتنے افسوس کی بات ہے۔“

آپریشن روم میں اسسٹنٹ سرجن اور نرسیں چہروں پر جراحی کے نقاب چڑھائے جنھوں نے ان کی آنکھوں سے نیچے کے سارے حصے کو چھپا رکھا تھا اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھے۔ اسے سنگ مرمر کی میز پر لٹا دیا گیا۔ اس نے سر میں جو تیز خوش بودارتیل ڈال رکھا تھا اس کی کچھ کچھ مہک ابھی تک باقی تھی۔ پٹیاں ابھی تک جبی ہوئی تھیں۔ حادثے سے اس کی دونوں ٹانگیں تو ٹوٹ چکی تھیں مگر سر کی مانگ نہیں بگڑنے پائی تھی۔

اب اس کے کپڑے اتارے جا رہے تھے۔ سب سے پہلے سفید سلک کا گلو بند اس کے گلے سے اتارا گیا۔ اچانک نرس شہناز اور نرس گل نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس سے زیادہ وہ کربھی کیا سکتی تھیں۔ چہرے، جودلی کیفیات کا آئینہ ہوتے ہیں جراحی کے نقاب تلے چھپے ہوئے تھے اور زبانیں بند۔

نوجوان کے گلو بند کے نیچے ٹکائی اور کالر تو کیا، سرے سے قیص ہی نہیں تھی۔ اوور کوٹ اتارا گیا تو نیچے سے ایک بوسیدہ اونی سویٹر نکلا جس میں جا بجا بڑے بڑے سوراخ تھے۔ ان سوراخوں سے سویٹر سے بھی زیادہ بوسیدہ اور میلا کچلا ایک بنیان نظر آ رہا تھا۔ نوجوان سلک کے گلو بند کو کچھ اس ڈھب سے گلے پر لپیٹے رکھتا تھا کہ اس کا سارا سینہ چھپا رہتا تھا۔ اس کے جسم پر ٹیل کی تہیں بھی خوب چڑھی

^۱ Mcleod Road - لاہور کی ایک مشہور سڑک جو ریلوے سٹیشن تک جاتی ہے۔

^۲ Assistant Surgeon - معاون سرجن ^۳ Stretcher - جس پر لٹا کر مریض کو لے جاتے ہیں۔

^۴ Operation Room - کمرہ جہاں آپریشن کیے جاتے ہیں۔

ہوئی تھیں۔ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم سے کم پچھلے دو مہینے سے نہیں نہایا۔ البتہ گردن خوب صاف تھی اور اس پر ہلکا ہلکا پوڈر لگا ہوا تھا۔ سوپٹر اور بنیان کے بعد پتلون کی باری آئی۔ پتلون کو پٹی کے بجائے ایک پرانی دھجی سے جوشاید کبھی تلخائی لہوگی خوب کس کے باندھا گیا تھا۔ بن اور بکسوںے غائب تھے۔ دونوں گھٹنوں پر سے کپڑا مسک گیا تھا اور کئی جگہ کھونچیں بھی لگی تھیں مگر چونکہ یہ حصے اوور کوٹ کے نیچے رہتے تھے اس لیے لوگوں کی ان پر نظر نہیں پڑتی تھی۔

اب بوٹ اور جرابوں کی باری آئی اور ایک مرتبہ پھر مس شہناز اور مس گل کی آنکھیں چارہوئیں۔

بوٹ تو پرانے ہونے کے باوجود خوب چمک رہے تھے مگر ایک پاؤں کی جراب دوسرے پاؤں کی جراب سے بالکل مختلف تھی۔ پھر دونوں جرابیں پھٹی ہوئی بھی تھیں۔ اس قدر کہ ان میں سے نوجوان کی میلی میلی ایڑیاں نظر آ رہی تھیں۔

بلاشبہ اس وقت تک وہ دم توڑ چکا تھا۔ اس کا جسم سنگ مرمر کی میز پر بے جان پڑا تھا۔ اس کا چہرہ جو پہلے چھت کی سمت تھا کپڑے اتارنے میں دیوار کی طرف مڑ گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جسم اور اس کے ساتھ روح کی اس برہنگی نے اسے خجل کر دیا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں سے آنکھیں چرا رہا ہے۔

اس کے اوور کوٹ کی مختلف جیسوں سے جو چیزیں برآمد ہوئیں وہ یہ تھیں:

ایک چھوٹا سا سیاہ کنگھا، ایک رومال، ساڑھے چھ آنے، ایک بجھا ہوا آدھا سگریٹ، ایک چھوٹی سی ڈائری جس میں لوگوں کے نام اور پتے لکھے تھے، نئے گراموفون ریکارڈوں کی ایک ماہانہ فہرست اور کچھ اشتہار جو مٹ گشت کے دوران میں اشتہار بانٹنے والوں نے اس کے ہاتھ میں تھما دیے تھے اور اس نے انھیں اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔

افسوس کہ اس کی بید کی چھڑی جو حادثے کے دوران میں کہیں کھو گئی تھی، اس فہرست میں شامل نہ تھی۔

(جاڑے کی چاندنی)

مشق

1- افسانہ ”اوور کوٹ“ کا متن پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملوں میں دیے گئے الفاظ میں سے درست لفظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کریں:

- i- جب وہ برابر چلا گیا تو رفتہ رفتہ وہ شرمانے سے لگے۔
(تکے، دیکھے، گھوڑے)
ii- نوجوان اپنی سے خاصا فیشن ایبل معلوم ہوتا تھا۔
(تراش خراش، صورت، شکل)
iii- نوجوان نے کو سیکڑا جس کا مطلب تھا ”اوتاتی“۔
(بھنوں، ہونٹوں، کندھوں)
iv- اُس کے ہونٹوں پر ایک اور پُر اسرار مسکراہٹ نمودار ہوئی۔
(خفیف، لطیف، عجیب)

2- نیچے دیے گئے سوالات اور سبق ”اوور کوٹ“ کو پیش نظر رکھ کر درست جواب کے شروع میں ”سر“ لگائیں۔

- i- افسانہ ”اوور کوٹ“ کا مصنف کون ہے؟
(ا) پریم چند (ب) افضل حق (ج) غلام عباس (د) ممتاز مفتی
ii- نوجوان نے ”اوور کوٹ“ کیوں پہن رکھا تھا؟
(ا) کیوں کہ اُس کے پاس کوئی اور لباس نہ تھا۔ (ب) کیوں کہ جاڑے کا موسم تھا۔
(ج) خوب صورت نظر آنے کے لیے۔ (د) اپنی اصلیت کو چھپانے کے لیے۔
iii- گلوبند اتارنے کے بعد نرسوں نے ایک دوسرے کی طرف کیوں دیکھا؟
(ا) کیوں کہ گلوبند بے حد خوب صورت تھا۔ (ب) کیوں کہ گردن پر گلوبند کا نشان تھا۔
(ج) کیوں کہ گلوبند پھٹ گیا تھا۔ (د) کیوں کہ گلوبند کے نیچے قمیص ہی نہ تھی۔
iv- نوجوان کی پتلون کیسی تھی؟
(ا) بالکل عام سی اور سادہ۔ (ب) پرانی اور جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی۔
(ج) نہایت شان دار۔ (د) پھٹی پرانی اور بکسوؤں کے بغیر۔
v- ”اوور کوٹ“ کا اختتام کس چیز کے ذکر پر ہوا؟
(ا) فیلٹ ہیٹ پر۔ (ب) بید کی چھڑی پر۔
(ج) اوور کوٹ پر۔ (د) گلوبند پر۔
vi- افسانہ نگار نے کس اوور کوٹ کو نیلام کا کہا؟
(ا) قراقلی اوور کوٹ کو۔ (ب) عوامی اوور کوٹ کو۔
(ج) خاکی پٹی والے اوور کوٹ کو۔ (د) خاکی پٹی کے پرانے فوجی اوور کوٹ کو۔

vii- سفید بلی دیکھ کر نوجوان نے کیا کہا؟

(ب) نو، تھینک یو!

(ا) پورٹل سول!

(د) سوری!

(ج) گڈ ایوننگ!

viii- نوجوان کو حادثہ کس سڑک پر جاتے ہوئے پیش آیا؟

(ب) لارنس روڈ پر

(ا) ڈیوس روڈ پر

(د) میکلوڈ روڈ پر

(ج) مال روڈ پر

3- درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین سطروں سے زائد نہ ہوں۔

i- مرگشت کرنے والے نوجوان کا ظاہری حلیہ کیسا تھا؟

ii- افسانہ ”اوور کوٹ“ میں اوور کوٹ کن خصوصیات کا حامل تھا؟

iii- نوجوان نے اوور کوٹ کے علاوہ کیا کچھ زیب تن کر رکھا تھا؟

iv- نوجوان کے اوور کوٹ کی جیب سے کون کون سی چیزیں برآمد ہوئیں؟

v- افسانہ نگار نے ”اوور کوٹ“ میں کن سڑکوں کا ذکر کیا ہے؟ ان کے نام لکھیے۔

vi- اس افسانے میں انگریزی زبان کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کے معنی لکھیں۔

4- افسانہ ”اوور کوٹ“ کا خلاصہ تحریر کریں جو اصل کے ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔

5- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں:

شام، لمبی لمبی، باریک باریک، سرد، بارونق۔

6- اپنے کالج میں بزم ادب یا ٹیوٹوریل گروپ میں اپنے تحریر شدہ یا اپنے پسندیدہ افسانے فردا فردا پڑھ کر سنائیں۔

7- اپنے کالج میگزین کے لیے کوئی افسانہ لکھیں۔

8- غلام عباس کا افسانہ ”بہر و پیا“ یا ”کتبہ“ پڑھیں اور اپنے تاثرات اپنی ڈائری میں لکھیں۔

سفارش

محفلے کی بڑی گلی کے موڑ پر تین چار تانگے ہر وقت موجود رہتے ہیں مگر اس روز میں موڑ پر آیا تو وہاں ایک بھی تانگا نہیں تھا۔ مجھے خاصی دور بھی جانا تھا اور جلدی بھی پہنچنا تھا، اس لیے تانگے کا انتظار کرنے لگا۔ تانگے تو بہت سے گزرے مگر سب لگے ہوئے تھے۔ اچانک میں نے فیکے کو چوان کو اپنی طرف آتے دیکھا تو پکارا ”بھئی فیکے تانگا کہاں ہے؟ تانگلا ونا۔“

”تانگلا تو بابو جی، آج نہیں جوڑا ہے۔“ فیکے نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا کہ فیکا کو چوان کا کو چوان اور پہلوان کا پہلوان تھا اس نے آج شیو بھی نہیں بنوایا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی سرے سے محروم تھیں اور بوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھیں۔

”کیا بات ہے فیکے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا: ”بابو جی ایک کام ہے۔“

”ہاں ہاں کہو۔“ میں نے کہا

”کام یہ ہے بابو جی کہ آپ میرے بابا کو تو جانتے ہیں نا؟“ فیکا بولا۔ ”اس کی ایک آنکھ چلی گئی ہے۔“

”اوہو: مجھے دکھ ہوا۔ کیسے گئی؟ کیا کوئی حادثہ ہوا؟“

”جی نہیں،“ فیکے کے چہرے پر بھول پن کا چھینٹا پڑ گیا۔

”لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی کل کیا ہوا کہ بابا مصری شاہ میں سے گزرا تو ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے تو ذرا سا لالے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اُس نے ”لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ“ پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی۔ بس پھر کیا تھا بابو جی، قسم کھا کر کہتا ہوں جب سے اب تک آنکھ لگی ہو۔ بابو جی، آپ تھک تو نہیں گئے؟ سگریٹ والے کی کرسی اٹھالائیں؟“

اس وقت فیکا مجھے ایسا لگا جیسے اس کے چوڑے چکلے سینے پر گڈے کا حیران سر رکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا: ”تم بھی حد کرتے ہو فیکے۔ اب آگے بھی کہونا۔“

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی۔ وہ بولا: ”بس بابو جی خدا آپ کا بھلا کرے۔ رات تو چیخ چاخ کے گزار دی۔ پھر صبح کو محلے کے سارے کوچوان اکٹھے ہوئے تو ان میں سے چچا شیدے نے کہا کہ پوست کے ڈوڈے پانی میں ابا لو اور اسی پانی سے آنکھ دھوؤ۔ دھوئی پر بابا اسی طرح تڑپتا رہا۔ پھر کسی نے کہا کہ پالک کا ساگ اُبال کر باندھو، باندھا اور جب کھولا تو بابا نے صاف کہہ دیا کہ اب کیا جتن کرتے ہو آنکھ کا دیا تو بجھ گیا۔ ہمارے گھر میں تو پٹن پڑ گئی بابو جی۔ اُسے ایک ہسپتال میں لے گئے، پھر دوسرے میں لے گئے۔ دونوں میں جگہ نہ تھی۔ دوپہر کو راج گڑھ کے ایک کوچوان نے بتایا کہ اس کا سالامیو ہسپتال¹ میں چوکی دار ہے۔ اُس کی سفارش سے جگہ تو مل گئی پر برانڈے میں۔ وہ بھی کوئی ایسی بات نہیں۔ پر بابو جی شام ہونے کو آئی ہے اور ابھی تک کوئی ڈاکٹر تو کیا کوئی نرس بھی ادھر نہیں آئی۔ آپ صاحب لوگ ہیں یہ دیکھیے ہاتھ باندھتا ہوں۔ میرے ساتھ چل کر کسی ڈاکٹر سے یہ کہ دیجیے کہ صدیقیے مریض کو ذرا سا دیکھ لے۔“

میں نے کہا ”وہاں ایک ڈاکٹر ہے، ڈاکٹر عبد الجبار۔ ان سے میرا سلام کہو۔ کام ہو جائے گا۔ نہ ہوا تو کل میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ اس وقت مجھے ایک دعوت میں جانا ہے، نام یاد کرو ڈاکٹر عبد الجبار۔“

فیکا میرے بہت سے شکریے ادا کر کے چلا گیا۔ پھر مجھے ایک خالی ٹانگا مل گیا۔ جب ٹانگا میو ہسپتال کے صدر دروازے کے سامنے سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ فیکا ایک چوکی دار سے باتیں کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر جبار کا پتا پوچھ رہا ہوگا۔ ایک بار جی میں آئی کہ ہسپتال جا کر جبار صاحب سے کہ دوں مگر اب ٹانگا آگے نکل گیا تھا اور مجھے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دور جا کر گھوڑا پھسل کر گرا اور دس منٹ تک گرا رہا۔ پھر جب اٹھا اور چلنے لگا تو فیکا ایک جبار صاحب کا سکوتر میرے ٹانگے کے قریب سے زن سے گزر گیا۔ ”جبار صاحب!“ میں چلایا مگر جبار صاحب میری آواز سے تیز نکلے۔

کوئی بات نہیں، میں نے سوچا، کل کہ دوں گا۔ کل پہلا کام ہی یہی کروں گا۔

رات کو میں گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا کوچوان آیا تھا اور کہہ گیا تھا کہ بابو آئیں تو مجھے بلا لیں۔

میں نے سوچا، اس وقت کون بلائے۔ اگر جبار صاحب ہسپتال ہی کو جا رہے تھے اور فیکے کا کام ہو گیا ہے تو شکر یہ صبح قبول کر لوں گا اور اگر کام نہیں ہوا تو جو بھی کوشش ہوگی صبح ہی کو ہوگی۔

صبح کو میں ابھی بستر سے نہیں نکلا تھا کہ فیکے نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ معلوم ہوا کہ رات جبار صاحب ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان کی ڈیوٹی آج دن کی ہے۔

”یعنی تمہارا باپ دسمبر کی اس سردی میں برآمدے ہی میں پڑا رہا؟“ میں نے اپنے انداز میں تشویش ظاہر کی۔

”جی ہاں،“ وہ بولا ”مگر یہ تو کوئی ایسی بات نہیں بابو جی۔ آپ نے ہمارا گھر نہیں دیکھا۔ دس سال سے چھتر میں پڑے ہیں۔“

”اور اس کی آنکھ؟“ میں نے پوچھا۔

¹ Mayo Hospital - لاہور کا سب سے بڑا ہسپتال جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔

”وہ تو چلی گئی بابو جی۔“ فیکا یوں بولا جیسے اس کے باپ کی آنکھ کو ضائع ہوئے برسوں گزر چکے ہیں۔

میں نے کہا: ”جب آنکھ جاہی چکی ہے تو بے چارے بڑھے کو ہسپتال میں کیوں گھسیٹتے پھرتے ہو؟ وقت بھی ضائع ہوگا روپیہ بھی ضائع ہوگا۔“

فیکا بولا: ”بابو جی کیا پتا آنکھ کے کسی کو نے کھد رے میں مینائی کا بھورا پڑا رہ گیا ہو۔ دیکھیے چولہا بجھ جاتا ہے تو جب بھی دیر تک راکھ میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔ کیا پتا کوئی چنگاری سلگ رہی ہو۔“

میں اس بات سے چونکا۔ آج تک فیکے نے مجھ سے صرف چارے کی مہنگائی اور آٹے میں ملاوٹ کے موضوع پر باتیں کی تھیں۔ پھر وہ عاجزی سے بولا ”ذرا سا میرے ساتھ چلے چلیے۔“

میرے جسم میں نیند ابھی پوری طرح غائب نہیں ہوئی تھی۔ پھر نہانا تھا۔ شیو کرنا تھا۔ چائے پینی تھی۔ میں نے کہا ”میں تمہیں اپنا کارڈ دیے دیتا ہوں۔ وہ ڈاکٹر جبار کو دکھا دو۔ بڑے یا آدمی ہیں۔ فٹافٹ کام کر دیں گے۔ تمہارا باپ ایک بار وارڈ میں چلا جائے، پھر علاج کے لیے تو میں خود جا کر کہوں گا۔“

وہ مجھ سے کارڈ لے کر یوں چلا جیسے دنیا جہاں کی دولت سمیٹے لیے جا رہا ہے۔ میں نے کارڈ پر لکھ دیا تھا۔ جبار صاحب! اس کا کام کر دیجیے، بے چارا بڑا ہی غریب آدمی ہے۔ دعائیں دے گا۔ اور مجھے یقین تھا کہ کام ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کو صرف اتنا ہی تو دیکھنا تھا کہ آنکھ پوری طرح بجھ گئی ہے یا تھوڑی بہت رقی باقی ہے۔

میں دن بھر گھر سے غائب رہا اور فیکا دن بھر میرے گھر کے چکر کاٹا رہا۔ شام کو اُس نے مجھے بتایا کہ ”جبار صاحب بیٹھے تو ہیں پر کوئی اندر نہیں جانے دیتا۔ کہتے ہیں باری سے آؤ اور میری باری آتی ہی نہیں۔ گھٹنا پا جاے میں سے جھانک رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔“

فیکے نے مجھے ایک بار پھر چونکا دیا۔ نہ جانے پہلوان فیکے کے اندر یہ حسناں فیکا اتنے برسوں سے کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ میں نے وعدہ کیا کہ کل ضرور چلوں گا۔ اب تو شام ہو گئی ہے۔

دوسرے دن سویرے ہی مجھے شیخوپورے جانا پڑ گیا۔ رات کو واپس آیا تو معلوم ہوا کہ فیکا آیا تھا۔

اس کے بعد تین دن تک میں نے زیادہ وقت گھر میں گزارا مگر فیکا نہ آیا۔ چوتھے روز میں نے گلی کے موڑ پر ایک کوچوان سے فیکے کے باپ کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اسے وارڈ میں جگہ مل گئی ہے۔ اتنے میں فیکا بھی آ نکلا۔ مجھے ذرا سی ندامت تھی، اس لیے جھوٹ بولنا پڑا۔ ”کیوں فیکے، جبار صاحب نے کام کر دیا نا؟“

وہ بولا۔ ”مگر بابو جی، وہ تو مجھ سے ملے ہی نہیں۔“

میں نے فوراً کہا۔ ”میں نے انہیں فون کر دیا تھا۔“

فیکے کا چہرہ ایک دم سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگ اٹھی۔ ”جیہی میں کہوں نرس بار بار یہ کیوں کہہ رہی ہے کہ دیکھو، بڑھے کو تکلیف نہ ہو۔“

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ میرے قدم آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے مگر ذہن جیسے شکست کھا کر بھاگا جا رہا تھا۔ رات کو نیند نے ندامت دور کر دی مگر صبح ہی فیکا دروازے پر موجود تھا۔ بولا ”آپ کی مہربانی سے داخلہ تول گیا تھا پر اب انھوں نے بابا کو کوٹ لکھت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے۔ یہ تو بڑا غضب ہوا بابو جی۔ آج میں اماں کو ساتھ لے کر گیا۔ دو روپے گل ہو گئے۔ کچھ ہو سکے تو کیجیے۔“

میں نے کہا۔ ”میں ابھی جا کر ڈاکٹر جبار کو فون کرتا ہوں۔“

میں نے فون کیا بھی مگر ڈاکٹر صاحب مل نہ سکے۔ پھر مصروفیتوں میں بات آئی گئی ہو گئی۔ پانچ چھ روز بعد میں نے فیکے کو دیکھا تو سوچا کہ نظریں پڑا کے ساتھ والی گلی میں مڑ جاؤں اور وہاں سے بھاگ نکلوں۔ مگر فیکا لپک کر میرے پاس آیا اور بولا۔ ”بابو جی، سمجھ میں نہیں آتا آپ کے کس کس احسان کا بدلہ اتاروں گا۔“

جھوٹ نے میری ندامت کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔ ”واپس آ گیا نا تمہارا بابا؟“

فیکا بولا۔ ”واپس بھی آ گیا اور اپریشن بھی ہو گیا۔ جمعے کو پٹی کھل رہی ہے۔ دعا کیجیے۔“

میں نے کہا۔ ”اللہ رحم کرے گا۔“

پھر وہ جمعے کی شام کو آیا تو بولتے ہی زار زار روئے لگا۔ ”بابو جی غضب ہو گیا پٹی کھلی تو پتا چلا۔ ایک آنکھ تو گئی ہی تھی، دوسری پر بھی اثر پڑ گیا ہے۔ کہتے ہیں اب پہلے اپریشن کا زخم ملے تو دوسرا اپریشن ہو گا اور دوسری آنکھ کا بھی ہو گا۔“

میں نے اسے تسلی دی اور اسے ساتھ لے کر سامنے ہی ایک دکان سے ڈاکٹر جبار کو فون کیا مگر بد قسمتی سے وہ فون پر موجود نہ تھے۔ پھر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ملوں گا۔ وہ ہسپتال میں نہ ہوئے تو انھیں گھر میں جا پکڑوں گا۔

دوسرے دن میں جانتا نہ سکا البتہ ڈاکٹر جبار کو فون ضرور کیا۔ وہ پھر غائب تھے۔

ادھر فیکا بھی غائب ہو گیا۔

شاید دو ڈھائی ہفتے بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ نوکرنے آکر بتایا کہ فیکا کو چوان آیا ہے۔ میں نے بھی اسے کھڑکی میں سے دیکھ لیا۔ بالکل ہلکی ہو رہا تھا۔

میں نے نوکر سے پوچھا۔ ”کیا تم نے اسے بتا دیا ہے کہ میں موجود ہوں؟“

”جی ہاں۔“ نوکر بولا۔ ”بس میرے منہ سے نکل گیا۔“

”بڑے احمق آدمی ہو۔“ میں نے اسے ڈانٹا اور کہا۔ ”جاؤ کہ دو کپڑے بدل رہے ہیں۔ آتے ہیں۔“

کپڑے تو میں نے بدل رکھے تھے البتہ میں اپنے تیور بدلنے کی کوشش کرنے لگا۔ پھر اچانک خیال آیا کہ کتنا چھوٹا آدمی ہوں دو پیسے یا دو روپے یا چلو دو لا کھی بھی بات نہیں۔ دو آنکھوں کی بات ہے اور میں جھوٹ بولے جا رہا ہوں۔ مجھے فیکے کے سامنے اعتراف کر

لینا چاہیے کہ میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکا۔ پھر میں نے وہ فقرے سوچے جو مجھے فیکے کے سامنے اس انداز سے ادا کرنے تھے کہ اسے
چکی بات بھی معلوم ہو جائے اور اسے دکھ بھی نہ ہو۔

میں باہر آیا تو فیکے کا بولنے ہی زار زار رونے لگا۔ بابو جی، کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ، کچھ سمجھ میں نہیں آتا..... اس کی آواز بھرا گئی۔
میرے سوچے ہوئے فقرے ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو گئے بمشکل میں نے کہا۔ ”فیکے بات یہ ہے فیکے کہ..... بات یہ ہے.....“
آنسوؤں سے بھیگا ہوا، بچوں کی طرح گول گول سرخ چہرے لیے فیکا اٹھا اور بولا ”بابو جی! کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ میں شکریہ ادا کروں
تو کیسے کروں۔“ میرا بابا ٹھیک ہو گیا ہے۔ اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ اُسے بینائی اللہ نے دی ہے اور آپ نے دی ہے۔ آپ
نے مجھے خرید لیا ہے بابو جی۔ قسم خدا کی میں عمر بھر آپ کا نوکر رہوں گا۔“
اور میں نے ایک بہت لمبی، بہت گہری سانس لے کر کہا۔ ”کوئی بات نہیں فیکے۔ کوئی بات نہیں۔“

(کپاس کا پھول)

مشق

- 1- افسانہ ”سفارش“ پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل جملے مکمل کریں۔
 - i- جی نہیں فیکے کے چہرے پر..... کا چھینٹا پڑ گیا۔
 - ii- فیکے کی آنکھوں میں..... کی نمی جاگی۔
 - iii- کیا پتا آنکھ کے کسی کو نے کھد رے میں..... کا بھورا پڑا رہ گیا ہو۔
 - iv- گھٹنا پا جاے میں سے..... رہا ہو تو باری کیسے آئے بابو جی۔
 - v- جھوٹ نے میری..... کو کان سے پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔
- 2- ”سفارش“ کا متن مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین سطور سے زائد نہ ہوں۔
 - i- فیکے کے باپ کی بینائی کیوں جاتی رہی؟
 - ii- سفارش کرنے والے نے ”کارڈ“ پر کیا لکھا؟
 - iii- سفارش کرنے والے نے فیکے کی موجودگی میں ڈاکٹر جہاڑ کو کب فون کیا؟
 - iv- سفارش کرنے والے نے اپنے نوکر کو کیوں ڈانٹا؟
 - v- فیکے نے عمر بھر مصنف کا نوکر رہنے کا اعلان کیوں کیا؟
- 3- ”سفارش“ کا مرکزی خیال تحریر کریں۔
- 4- ”سفارش“ کا خلاصہ تحریر کریں جو افسانے کے اصل متن کے ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو۔
- 5- سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل پیرا گراف کی تشریح کریں:

فیکے کی آنکھوں میں ممنونیت کی نمی جاگی..... مریض کو ذرا سادہ کچھ لے۔

چراغ کی لو

شام کی بڑھتی ہوئی اداس تاریکی میں سامنے کی ہر چیز آہستہ آہستہ دھندلی پڑتی جا رہی تھی۔ اس نے نظریں پھرا پھرا کر بغیر پلستر کی دیواروں کو دیکھنا شروع کیا جو اندھیرے میں ڈوب کر بھیا تک ہوتی چلی جا رہی تھیں جیسے وہ سیاہ رنگ میں نہا گئی ہوں!..... اندھیرا اور تنہائی! اس کا جی اٹنے لگا تو کھانسی ہوئی اٹھ کر بیٹھ گئی..... اسے اپنے باپ کا انتظار تھا جو کام پر سے آکر جانے کہاں چلتا ہوا تھا۔

”نہ جانے کہاں بیٹھ رہے ابا؟ یہ خیال نہیں آتا کہ اکیلے گھر میں جی گھبراتا ہوگا میرا۔“ وہ جھنجھلاہٹ میں رہ رہ کر بس یہی سوچ رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ زور زور سے رونے لگے۔ لیکن آنسوؤں کا ذخیرہ جیسے حلق میں انک کر رہ گیا تھا۔ اس سے رویا بھی نہ گیا۔

اس نے دوبارہ الجھ کر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا تو ہر طرف بس یوں نظر آنے لگا جیسے نئے سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ڈھانچے سامنے کی اندھیری کوٹھڑی سے نکل نکل کر سارے گھر میں گھوم پھر رہے ہوں..... اس کے ذہن پر ان ڈھانچوں کی ہڈیوں کی جھج اور نئے سفید کپڑوں کی مدھم کھڑکڑاہٹ اس طرح چھا گئی کہ وہ آنکھیں میچ کر دوبارہ چارپائی پر لڑھک گئی..... بالکل بے حس و حرکت جیسے اس کا دم ہی نکل گیا ہو..... سفید کپڑوں میں لپٹے ہوئے ڈھانچوں کی ہڈیوں کی جھج اور کپڑوں کی کھڑکڑاہٹ۔ یہ تو بس اس کا وہم ہی وہم تھا۔ کچھ دنوں سے جسم کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی بہت کمزور ہو گیا تھا۔ رات تو خیر رات ہی تھی۔ وہ دن دوپہر بھی اکثر یہی وہم کرتی..... بس جدھر بھی نظر جما کر دیکھتی یہی لگتا کہ کوئی سفید سفید کپڑوں میں لپٹا چلا آ رہا ہے۔ بالکل اسی وضع کے کپڑے جو اس کی ماں کو مرنے کے بعد پہنائے گئے تھے۔ دروازہ مانوس طریقے پر چرمرایا اور پھر کھٹ سے بند ہو گیا اور اس نے کپکپا کر آنکھیں کھول دیں۔ جب کچھ نظر نہ پڑا تو مری ہوئی آواز میں بولی۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں اچھن۔“ یہ اس کے باپ کی آواز تھی۔

”کہاں تھے ابا؟ میرا دل اکیلے میں گھبراتا تھا۔“ اس نے شکایت کی تو جیسے اس کے حلق میں آنسوؤں کا ذخیرہ دوبارہ بھنس گیا اور آنکھیں تپنے لگیں۔

”ذرا کام سے گیا تھا..... چراغ نہیں جلایا؟“ باپ نے چارپائی کے پائے سے ٹھوکر کھائی تو جھلا کر پوچھا اور اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

”دیا سلائی نہیں تھی۔“

”یہ لو دیا سلائی۔“ باپ نے جیب سے دیا سلائی نکال کر ایک بیزی سلگائی تو دیا سلائی کی روشنی میں اس کا چہرہ بڑا وحشت زدہ

سانظر آیا۔ ابھی ہوئی کچھڑی ڈاڑھی، ہونٹوں پر اوندھی ہوئی مونچھیں، لکڑیوں سے پٹی ہوئی پیشانی اور ابلی ہوئی آنکھیں..... تیلی جل کر ایک نضی سی سرخ کمان کی طرح خم کھا گئی اور چرماتی ہوئی بیڑی کا دھواں چھوٹے سے آگن میں پھیل گیا۔

”اوں..... نہداوں“ وہ کانکھتی ہوئی پٹی پر زور دے کر اٹھ بیٹھی۔ بیڑی کے دھوئیں سے اس کا جی متلارہا تھا۔

”کیسا جی ہے اچھن؟“ باپ نے بیڑی کا ایک طویل کش لیا تو ہلکی سی سرخ روشنی میں اس کی ابلی ہوئی آنکھیں چمک گئیں۔

”بیڑی نہ پیو!..... اس کے دھوئیں سے میرا جی الٹتا ہے“ اور وہ اپنے بخار سے بھاری سر کو کندھوں پر جھکا جھکا کر بیڑی سے کانکھنے لگی۔

باپ کو غصہ آ گیا۔ کتنی دیر بعد تو اس نے بیڑی سلگائی تھی۔ جب سے بیڑی کا بندل چھپے پیسے کا ہو گیا تھا وہ تمام دن اور رات میں صرف چار بیڑیاں پیتا۔ مارے طلب کے جماہیوں پر ہماہیاں آتیں۔ لیکن اپنا جی مارتا اور اس وقت بیٹی نے حکم لگا دیا کہ نہ پیو۔

”تیرا جی تو ہر بات میں الٹا کرتا ہے..... کچھ دماغ چل گیا ہے تیرا؟“ باپ نے تیز آواز میں کہا اور اچھن بغیر کچھ جواب دیے اٹھی اور دیاسلانی کی ڈبیا لے کر دالان میں ریگ گئی۔

گھر کی سنسان تاریکی میں دیاسلانی کے رگڑنے کی آواز گونجی اور سیاہ طاق میں رکھے ہوئے چراغ پر مدھم سی لوچکنے لگی..... بوسیدہ دالان کے ستون کا سایہ چھوٹے سے آگن سے گزر کر سامنے کی دیوار تک چڑھ گیا تو اچھن نے دیاسلانی کی ڈبیا مٹھی میں دبا کر اپنا سر طاق کے برابر ٹیک دیا اور پتلیاں پھرا کر چراغ کی ٹٹمائی ہوئی لو کو دیکھنے لگی۔

باپ نے بیڑی چار پانی کی پٹی پر رگڑ کر بھادی اور اسے دوبارہ پینے کے خیال سے اپنے کان پر جما کر اچھن کی طرف دیکھا تو اسے جیسے دھچکا سا لگا۔ اندھیرے میں پناہ ڈھونڈتی ہوئی روشنی میں وہ اس طرح کھڑی ہوئی بڑی بھیا نک لگ رہی تھی..... ہڈیوں پر منڈھی ہوئی سیاہ کھال الجھے الجھائے جھونجھ ایسے بال، کھلے ہوئے ہونٹ اور پھری ہوئی پتلیاں..... بس جیسے وہ دیوار سے ٹک کر مر گئی ہو۔

ابھی دوسرا ہی سال تو تھا کہ باپ نے اچھن کی ماں کو بالکل اسی حالت میں بستر پر پڑے دیکھا تھا۔ کھلے ہوئے ہونٹ اور پھری پتلیاں..... یہ دیکھ کر وہ بجائے رونے دھونے کے گزروں نئے کپڑے کے پھیر میں پڑ گیا تھا۔ چیتھڑوں گدڑوں پر پڑا ہوا غریب عورت کا بے جان جسم..... اسے دنیا کے قاعدے کے بموجب کفن چاہیے تھا۔ گزروں نیا، تھان پر سے اُتار ہوا کپڑا..... چاہے وہ زندگی میں ایک عرصے سے چھالیٹن کے ایک گھیر کھا روالے پا جائے کو ترستی ہی رہی ہو مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟..... غریبوں کو امیروں کی برابری کرنے کا بس ایک ہی موقع ملتا ہے دنیا میں اور وہ مرنے کے بعد صرف کفن لینے کے بارے میں۔ آہا! اصل بات تو یہ ہے کہ غریب پیدا ہی اس لیے ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد امیروں کی برابری کر لیں..... تو اچھن کی ماں کے لیے کفن چاہیے تھا اور اس کے لیے اچھن کا باپ انتہائی فکر مند تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اچھن کی ماں زندگی میں ہر ایک کے سامنے لیرے لیرے کپڑوں میں پھری تھی۔ اس کا یہ مطلب تھوڑی تھا کہ وہ قبر میں بھی یوں رکھ دی جاتی اس لیے اس نے جان پہچان والوں کے دروازے کھٹکھٹائے۔

ادھر ادھر بہت دوڑا بے چارہ لیکن کہیں سے بھی اتنے روپے کا انتظام نہ ہو سکا کہ کفن خریدا جاسکتا۔ انتظام ہوتا بھی کیسے؟ اس کی جان پہچان والے ہی کون سے دو وقت پیٹ بھر کھانے والوں میں سے تھے؟ آخر وہ سب کی طرف سے مایوس ہو کر اپنے مالک کے پاس گیا۔ جن کی دکان پر وہ دس روپے مہینے کے عوض صبح سے شام تک حساب کتاب لکھا کرتا تھا۔

اس نے اپنی ابھی ہوئی میلی ڈاڑھی کو آنسوؤں سے بھگو کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ مالک! میرے گھر میں بے کفن کی لاش پڑی ہے کچھ قرض..... اور مالک نے بات کاٹ کر نرم لہجے میں جواب دیا۔ ”منشی جی! یہ اللہ کے گھر کا کام ہے، قرض نہیں لو۔ یہ روپے، ادا کرنے کی فکر نہ کرنا“ تا جہ مالک نے پچیس روپے اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

روٹیوں کو ترستی، کپڑے کو تلمکتی اور حکیم صاحب کا سنہ پینے کو سستی ہوئی اچھن کی ماں ایک دم پچیس روپے کا خرچ کروا کے زمین میں جا چھپی.....

”اور اب..... اب اچھن“..... باپ فکر مند آنکھوں سے اچھن کو تک رہا تھا جواب تک بے حس و حرکت دیوار سے سر نیچے چراغ کی مدھم لو کو پتلیاں پھرائے تنگے جا رہی تھی۔

ماں کے مرنے کے بعد سے اسے بھی نہ جانے کیا ہوتا جا رہا تھا۔ بس گھلتی ہی چلی جا رہی تھی۔ وہی ماں کی سی ٹھسکے دار کھانسی اور ہلکا ہلکا بخار..... ادھر پڑی ہے، ادھر پڑی ہے۔ باپ غریب اس کی حالت کو سمجھتا تو خوب مگر وہ علاج کیا خاک کرتا۔ زیادہ سے زیادہ وہی خیراتی ہسپتال کی دوائیں، جن میں دو تو برائے نام تھیں ہاں پانی ہی پانی ہوتا..... سرکاری ہسپتال میں دی جانے والی دوائیں الٹا نقصان ہی کرتیں..... وہ جب اچھن کی ماں کے لیے کچھ نہ کر سکا تو اچھن کے لیے کہاں سے ڈاکٹر پکڑ لاتا..... پہلے بھی دس روپے پاتا تھا اور اب بھی۔ ہاں روپے کی قیمت بازار میں پہلے سے کہیں زیادہ گھٹ گئی تھی۔ جب اچھن کی ماں مری تھی تو بازار میں آٹا چار سیر روپے کامل جاتا تھا اور اب ڈھائی روپے سیر بھی مشکل سے ملتا۔ ہر چیز مہنگائی کی انتہا کو پہنچ چکی تھی لیکن دکان کا پرانا منشی اتنا ہی سستا تھا جتنا بیس سال پہلے۔ اس کی آنکھوں کے سامنے لڑائی شروع ہونے سے قبل جو چیزیں دو پیسے کو لے کر دکان میں بھری گئی تھیں وہ لڑائی شروع ہوتے ہی مہنگی ہوتی گئیں یہاں تک کہ دو پیسے کی چیز نے آٹھ دس گنا نفع دیا، گویا چیزیں جیسے جیسے پرانی ہوتی گئیں ویسے ویسے قیمتی بھی لیکن اس پرانے منشی کے دس روپے کی قیمت بازار میں گھٹتی ہی چلی گئی..... دکان میں ہن برس رہا تھا۔ مالک کے نام پر بینک میں سونے چاندی کے پہاڑ کھڑے ہو رہے تھے تو اسے کیا۔ وہی مثل کہ بی بی عید آئی۔ جواب ملا۔ دور موٹی تجھے اپنی ٹکیا روٹی سے مطلب..... اسے تو جیسے اپنے دس روپوں کے سائے میں بٹھا دیا گیا تھا۔ جہاں ضروریات زندگی کی قیمتوں کا دائرہ روز بروز تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سنا کہ مل مزدوروں نے مہنگائی بھتہ لینا شروع کر دیا۔ کسانوں کی بن آئی۔ معمولی دکانوں کے ملازموں کی تنخواہوں میں بھی اضافہ ہو گیا اور یہاں تک کہ بوجھ اٹھانے والوں نے بھی اپنی مزدوری بڑھادی تو اس کے دل میں بھی امنگ اٹھی کہ مالک سے صاف کہہ دے کہ میری تنخواہ بڑھاؤ.....

لیکن شاید مالک نے اس کا خیال بھانپ کر پہلے ہی سے ہر وقت سنا شروع کر دیا کہ منشی جی بڑھاپے سے تمہارا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ اب گھر بیٹھو نوکری چھوڑ کر۔ یہ دیکھو تم نے حساب میں اتنی اتنی رقم ابھی تک نہیں جوڑی مجھے منشیوں کی کمی نہیں۔ میں تو تمہارے

پرانے ہونے کا خیال کرتا ہوں۔ سمجھے.....“ آئے دن یہ سن کر اس کا جی سوکھتا کہ کہیں ان دس روپوں کے بھی لالے نہ پڑ جائیں اور وہ اس دن کو کوستا جب اس کے دل میں تنخواہ بڑھوانے کا منحوس خیال آیا تھا..... اچھن سوکھتی جا رہی تھی، اس کے لیے وہ انتہائی فکر مند تھا۔ پاس پڑوس والے کہتے کہ مٹھی جی! جب لونڈیا کو کھلا پہنا نہیں سکتے بیمار ہے تو کوڑی کی دوا نہیں دے سکتے تو اسے اپنے گھر بار کا کردو..... کھائے پہنے گی تو آپ ہی اچھی ہو جاوے گی۔ لیکن مشورہ دینے والے جیسے یہ سوچتے ہی نہ تھے کہ غریب کی لڑکی غریب ہی کے گھر جائے گی، کسی دس بارہ روپے پانے والے کی عورت کیا پہنے گی اور کیا کھائے گی۔ آخر اچھن کی ماں بھی تو شوہر والی تھی کون سا سکھ اٹھا لیا غریب نے؟

اچھن کو اس قدر عجیب طریقے سے کھڑے دیکھ کر باپ کی طبیعت الجھتی ہی چلی جا رہی تھی..... اچانک اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس کے بیڑی پینے کے بارے میں تو اتنی رنجیدہ نہیں ہوگی۔

”اچھن! اس طرح کیوں کھڑی ہے؟ اب میں بیڑی نہیں پیوں گا۔“

”کچھ نہیں ابا.....“ اس نے دیوار سے سر اٹھا کر غور سے باپ کی طرف دیکھا۔ ”میں سوچ رہی تھی کہ چراغ کی لو بڑھا دوں ذرا۔“ اس کے لہجے میں بڑی آرزو اور خوشامد تھی۔

لیکن یہ سن کر باپ پر سے جیسے بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اتنی معمولی سی بات تھی جس کے لیے وہ اتنی دیر سے یوں کھڑی تھی۔ اس نے سوچا سچ اچھن کا دماغ چل گیا ہے۔ اندھیرے کو روشنی میں تبدیل کرنے کا خیال اس کے نزدیک پاگل پن تھا۔ مگر آخر کیوں؟ اس نے کہا۔

”جانتی ہے کہ اٹھواروں میں کہیں دو پیسے کا منی کا تیل نصیب ہوتا ہے اس پر بھی بھیڑ بھاڑ میں بیروں کا قیمہ بنتا ہے، کپڑے پھٹتے ہیں..... کب سے کہ رہا ہوں کہ تیل پر کنٹرول ہے اور ٹو ہے کہ روز روز لو بڑھانے کی ضد کیا کرتی ہے۔“

”تو کیا فائدہ ایسے اُجالے سے۔ دکاندار اتنا تیل بھی نہ دیا کرے۔ اس سے تو اندھیرا پڑا رہے۔ نام تو نہ ہو چراغ جلنے کا۔“ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی آرزو کے ننھے ننھے دیے اچانک بجھ گئے۔

”فائدہ واندہ کچھ نہیں معلوم مجھے۔ بس اتنا ہی تیل ملے گا کہ چراغ جلتا رہے۔“ باپ کی آواز تیز ہو گئی جیسے اس احساس نے اسے غصہ دلا دیا ہو۔

”چاہے روشنی نہ ہو۔“ اس کے ہونٹ پھڑک اٹھے۔

”ہاں۔“ باپ کا جواب گھر کی سنان نیم تار کی کو اور بھی تار یک کر گیا۔

”میرا تو جی اللتا ہے ایسے اُجالے سے۔“ اس نے مردہ سی آواز میں کہا لیکن باپ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے وہ بیٹی کے بات بات میں جی گھبرانے سے ناراض ہو گیا ہو۔.....

وہ مایوس ہو کر لڑکھڑاتی ہوئی دالان سے نکل آئی اور اپنی چار پائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ اسے اپنے ابا پر غصہ آ رہا تھا کہ آخر وہ اس برائے نام روشنی پر قناعت کیوں کرتے ہیں؟ مٹی کا تیل اسے روزانہ کیوں نہیں ملتا؟ جب کہ گلی کے کھڑوالے خوبصورت دو منزلہ گھر میں تمام رات بڑی بڑی لالٹینوں کی روشنی ہوتی رہتی ہے..... لیکن اس کا جھنجھلایا ہوا دماغ یہ سوچ ہی نہ سکا کہ اگر تیل لڑے بھڑے ملنے بھی لگے تو اس مد کے لیے دو پیسے روز کس کے گھر سے آئیں گے جب کہ اس کے باپ کو سخت محنت کی قیمت صرف اتنی ہی ملتی ہے کہ وہ جیسے تو کیا ہاں جینے کی بھونڈی سی نقل اتار رہا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے سیاہ طاق میں رکھا ہوا چراغ..... جس کی مدھم روشنی پر چاروں طرف سے اندھیرا منڈ رہا تھا.....

اچھن پیچ و تاب کھاتی اپنی چار پائی پر لڑھک گئی۔ اس کا جی گھبرا رہا تھا اور ہر طرف سے سفید نئے کپڑوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ زور زور سے رو کر اپنے ابا کی قناعت پسندی کا ڈھنڈورا پیٹے..... لیکن اس سے رویا بھی نہ گیا۔ آنسوؤں کا ذخیرہ تو جیسے حلق میں ہی پھنس کر رہ گیا تھا۔

(سب افسانے میرے)

مشق

1- افسانہ ”چراغ کی لو“ کا متن مد نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

- i- اچھن کس بیماری میں مبتلا تھی؟
 - ii- اچھن کا باپ کیا کام کرتا تھا؟
 - iii- دکان کے مالک نے منشی جی کو روپے کیوں دے دیے؟
 - iv- اچھن کے لہجے میں کس بات کی آرزو اور خوشامد تھی؟
 - v- اچھن کے ابا نے یہ کیوں کہا کہ میں بیڑی نہیں پیوں گا؟
 - vi- اس افسانے میں ہمارے کس معاشرتی رویے پر تنقید کی گئی ہے؟
- 2- افسانہ ”چراغ کی لو“ کا مرکزی خیال تحریر کریں۔
- 3- افسانہ ”چراغ کی لو“ کا خلاصہ لکھیں۔
- 4- ”سرمایہ اردو“ میں شامل افسانوں میں سے آپ کو کون سا افسانہ اچھا لگا اور کیوں؟ اپنے ٹیوٹوریل پیئر میں وضاحت کریں۔

مکتوباتِ غالب

بنام میر مہدی حسین مجروح

سید صاحب

نہ تم مجرم، نہ میں گنہگار۔ تم مجبور، میں ناچار۔ لو اب کہانی سنو، میری سرگزشت میری زبانی سنو۔ لو اب مصطفیٰ خاں یہ معادسات برس کے قید ہو گئے تھے، سوان کی تقصیر معاف ہوئی اور ان کو رہائی ملی۔ صرف رہائی کا حکم آیا ہے۔ جہاں گیر آباد کی زمینداری اور دلی کی املاک اور پنشن کے باب میں ہنوز کچھ حکم نہیں ہوا۔ ناچار وہ رہا ہو کر میرٹھ ہی میں ایک دوست کے مکان میں ٹھہرتے ہیں۔ بہ مجر دستماع اس خبر کے، ڈاک میں بیٹھ کر میرٹھ گیا۔ اُن کو دیکھا۔ چار دن وہاں رہا، پھر ڈاک میں اپنے گھر آیا۔ تاریخ آنے جانے کی یاد نہیں، مگر ہفتہ کو گیا، منگل کو آیا۔ آج بدھ دوم فروری ہے۔ مجھ کو آئے ہوئے نواں دن ہے۔ انتظار میں تھا کہ تمہارا خط آئے تو اس کا جواب لکھا جائے۔ آج صبح کو تمہارا خط آیا۔ دوپہر کو میں جواب لکھتا ہوں:

روز اس شہر میں اک حکم نیا ہوتا ہے
کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہوتا ہے

میرٹھ سے آ کر دیکھا کہ یہاں بڑی شدت ہے اور یہ حالت ہے کہ گوروں کی پاسبانی پر قناعت نہیں ہے۔ لاہوری دروازے کا تھانے دار مونڈھا چھا کر سڑک پر بیٹھتا ہے جو باہر سے گورے کی آنکھ بچا کر آتا ہے، اس کو پکڑ کر حوالات میں بھیج دیتا ہے۔ حاکم کے ہاں سے پانچ پانچ بید لگتے ہیں یا دور روپے جرمانہ لیا جاتا ہے۔ آٹھ دن قید رہتا ہے۔ اس سے علاوہ سب تھانوں پر حکم ہے کہ دریافت کرو، کون بے ٹکٹ مقیم ہے اور کون ٹکٹ رکھتا ہے۔ تھانوں میں نقشے مرتب ہونے لگے۔ یہاں کا جمعدا میرے پاس بھی آیا۔ میں نے کہا: بھائی، تو مجھے نقشے میں نہ رکھ، میری کیفیت کی عبارت الگ لکھ۔ عبارت یہ کہ اسد اللہ خاں پنشن دار ۱۸۵۰ء سے حکیم پٹیل والے کے بھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔ نہ کالوں کے وقت میں کہیں گیا، نہ گوروں کے زمانے میں نکلا اور نہ نکالا گیا۔ کرنل برون صاحب بہادر کے زبانی حکم پر اس کی اقامت کا مدار ہے۔ اب تک کسی حاکم نے وہ حکم نہیں بدلا۔ اب حاکم وقت کو اختیار ہے۔ پرسوں یہ عبارت جمعدا نے محلے کے نقشے کے ساتھ کو تو لی بھیج دی۔ کل سے یہ حکم نکلا کہ یہ لوگ شہر سے باہر مکان وکان کیوں بناتے ہیں؟ جو مکان بن چکے ہیں انھیں ڈھا دو اور آئندہ کی ممانعت کا حکم سنا دو اور یہ بھی مشہور ہے کہ پانچ ہزار ٹکٹ چھاپے گئے ہیں جو مسلمان شہر میں اقامت چاہے، بقدر مقدور نذرانہ دے۔ اس کا اندازہ قرار دینا حاکم کی رائے پر ہے۔ روپیہ دے اور ٹکٹ لے۔ گھر برباد ہو جائے، آپ شہر میں آباد

۱۔ گویا ۲۲۔ جنوری کو میرٹھ گئے اور ۲۵ جنوری کو لوٹے۔

۲۔ اس کا نام برون نہیں برن (Burn) تھا۔ وہ فتح دہلی کے بعد شہر کا فوجی گورنر مقرر ہوا تھا۔

ہو جائے۔ آج تک یہ صورت ہے، دیکھیے شہر کے بسنے کی کون مہورت ہے؟ جو رہتے ہیں وہ بھی اخراج کیے جاتے ہیں یا جو باہر پڑے ہوئے ہیں، وہ شہر میں آتے ہیں؟ الملک للہ والحکم للہ۔

نور چشم میر سرفراز حسین اور برخوردار میر نصیر الدین کو دعا اور جناب میرن صاحب کو سلام بھی اور دعا بھی۔ اس میں سے جو چاہیں قبول کر لیں۔

غالب

بدھ ۲۔ فروری (۱۸۵۹ء)

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

بھائی!

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمہارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمہیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کراچی کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینہ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینہ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھانی ہو گئی۔ کہیں لگن، کہیں چلچلی، کہیں اگلا لدان رکھ دیا۔ قلمدان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھڑی میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتی نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمہارے قصائد دیکھے جائیں گے۔

میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمہاری خیر و عافیت ان سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں، احسن اللہ خاں معالج ہیں، فصد ہو چکی ہے، جو تکلیف چکی ہیں، اب مسہل کی فکر ہے، سو اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ میں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحب فراش ہوں۔ کوئی شخص نیا تکلف کی ملاقات کا آجائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسودات دیکھتا ہوں۔ اللہ اللہ!

غالب

صبح جمعہ ۱۴ ماہ اکتوبر ۱۸۶۳ء

(خطوط غالب مرتبہ مولانا غلام رسول)

مشق

1- مکاتیب غالب پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- نواب مصطفیٰ خاں رہا ہو کس شہر میں گئے؟

ا۔ دہلی ب۔ لکھنؤ

ج۔ بنارس د۔ میرٹھ

ii- بقول غالب جنوری 1859ء میں شہر میں بلائٹ داخل ہونے پر حاکم سے سزا ملتی تھی:

ا۔ آٹھ دن قید ب۔ دس دن قید

ج۔ بارہ دن قید د۔ چودہ دن قید

iii- حاکم وقت نے حکم دیا:

ا۔ شہر کے مکان ڈھانے کا

ب۔ شہر سے باہر والے مکان ڈھانے کا

ج۔ شہر سے باہر مکان ڈھانے اور آئندہ ممانعت کا

iv- ہرگوپال تفتہ نے برائے اصلاح غالب کو کیا بھیجا تھا؟

ا۔ غزلیں ب۔ نظمیں

ج۔ قصائد د۔ مثنویاں

v- بقول غالب صاحب فراش ہوتے ہوئے وہ مسودات کس طرح دیکھتے تھے؟

ا۔ لیٹے لیٹے ب۔ چلتے پھرتے

ج۔ کھڑے کھڑے د۔ بیٹھے بیٹھے

2- ”مکاتیب غالب“ کا متن پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں جو تین تین سطور سے زیادہ نہ ہوں۔

i- غالب نے میرٹھ کا سفر کیسے طے کیا؟

ii- نواب مصطفیٰ خاں دوست کے ہاں کیوں ٹھہرے؟

iii- 1859ء میں حکم کی بابت غالب نے اپنے شعر میں کیا کہا ہے؟

iv- ہرگوپال تفتہ کے نام خط میں مذکورہ تلخ کی وضاحت کریں۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

سرگزشت، اقامت، فصد، مسہل، مسودات۔

مکتوباتِ اقبالؒ

مولانا غلام قادر

مولانا گرامی کے نام

لاہور ۲ مارچ ۱۹۲۲ء

جناب مولانا گرامی!

میں ابھی تک علیل ہوں، گو پہلے کی نسبت بہت افادہ ہے۔ دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ کامل صحت عطا فرمائے۔ حکیم اجمل خاں صاحب نے دہلی سے دوا بھیجی تھی مگر اس سے بھی بہت کم فائدہ ہوا۔ کل گورداس پور سے ایک حکیم صاحب خود بخود تشریف لے آئے تھے۔ انھیں کسی سے میری علالت کا حال معلوم ہوا تھا۔ دوا دے گئے ہیں جس سے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس دوا سے فائدہ ہو جائے گا کیونکہ جن اجزاء سے یہ مرکب ہے ان میں سے ایک اخلاص بھی ہے جو ان حکیم صاحب کو خود بخود میرے مکان تک لے آیا۔ بہر حال خدا تعالیٰ کے فضل کا منتظر ہوں۔

میاں ریاض صاحب نے آپ کو لاہور کی دعوت دی اور انجمن حمایت اسلام لاہور نے دعوت دی۔ افسوس ہے آپ نے کسی کی دعوت قبول نہ کی۔ میری تو یہ رائے ہے کہ ضرور ان دونوں کی دعوتوں کو قبول فرمائیے۔

میں تو اپنے آپ کو اس درد کی وجہ سے رفتی سمجھتا تھا مگر محض اس خیال سے تسکین تھی کہ پاؤں کا درد ہے۔ حرکت محال ہے، رفتی نہیں آدنی ہوں۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید ہے کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ممکن ہو تو لاہور ضرور آئیے اور لوگوں کو اپنا تازہ کلام بھی سنائیے۔

کل بمبئی سے ایک عرب کا خط آیا ہے جو "اسرار خودی" کو عربی میں ترجمہ کرنا چاہتا ہے اور اس کی اجازت مانگتا ہے۔ میں نے اسے اجازت دے دی ہے۔

مخلص

محمد اقبال

میاں ریاض الدین صاحب، میاں سراج الدین تاجر کتب کشمیری بازار کے فرزند تھے۔ انھوں نے کوچہ کوٹھی داراں میں ایک حویلی بھی "ریاض منزل" کے نام سے تعمیر کی تھی جو بعد میں ملک الال دین قیصر نے خرید لی تھی۔ میاں ریاض الدین رئیسوں کی طرح رہتے تھے۔ نہایت کشادہ دست تھے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ ان کے مکان پر اکثر ادب کی تحفیں برپا ہوتی تھیں جن میں مشاہیر ملک شرکت فرماتے تھے۔

اکبر الہ آبادی کے نام

لاہور ۱۳ ستمبر ۱۸ء
مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ ابھی ملا۔ الحمد للہ کہ خیریت ہے۔ ابھی تو مسلمانوں کو اور ان کے لڑ بچہ کو آپ کی سخت ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو عمر خضر عطا فرمائے۔

میں ۹ ستمبر کو لاہور واپس آ گیا تھا مگر ترشی کے زیادہ استعمال سے دانت میں سخت درد ہو گیا جس نے کئی روز تک بے قرار رکھا۔ اب خدا کے فضل سے بالکل اچھا ہوں۔ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ^۱ (انگریزی) کے اگست کے نمبر میں ڈاکٹر عبدالرحمن صاحب نے ایک ریویو^۲ بعنوان ”دو دنوں مثنویوں پر لکھا ہے۔ نہایت قابلیت سے لکھا ہے۔ اگر اس ریویو کی کوئی کاپی مل گئی تو اس سال خدمت کروں گا۔ آج ”زمانہ“ میں ایک ریویو نظر سے گزرا۔ ”زمانہ“ کے اسی نمبر میں آپ کے اشعار بھی دیکھے جن کو کئی دفعہ پڑھا ہے اور ابھی کئی بار پڑھوں گا۔ بالخصوص ایک نہایت مخلص نوجوان یہاں لاہور میں ہے، تاجر کتب ہے اور مجھ سے کہتا ہے کہ ”شکوہ“ اور ”جواب شکوہ“ کو پھر شائع کرنا چاہیے مگر مولانا اکبر دیا چہ لکھیں۔ میں نے آپ کی طرف سے ہر چند عذر کیا مگر وہ مُصر ہے۔ آخر میں نے اس سے وعدہ کیا کہ مولانا کی خدمت میں عرض کروں گا۔ ایسی فرمائش کرتے ہوئے حجاب آتا ہے کہ مجھے آپ کے ضعف و ناتوانی کا حال معلوم ہے۔ تاہم اگر کسی روز طبیعت شگفتہ ہو اور آلام و افکار کا احساس، شگفتگی طبع سے کم ہو گیا ہو تو دس پندرہ سطور اس کی خاطر لکھ ڈالیے۔ یہ لڑکا آپ کا غائبانہ مرید ہے۔

کلکتہ کے فساد کے حالات اخبار میں پڑھے تھے آج مزید حالات پڑھے۔ خدا تعالیٰ مسلمانوں پر فضل کرے۔

مجھے بھی کلکتہ سے بلاوا آیا تھا اور میں جانے کو قریب آیا تھا مگر جب مطبوعہ خط کا مضمون والد مکرم کو سنایا تو انھوں نے فرمایا کہ حکام غالباً یہ جلسہ بند کر دیں گے۔ بعد میں ایسا ہی ہوا۔

محراب

(مکاتیب اقبالؒ مرتبہ سید مظفر حسین برنی)

مشق

۱- درست جواب کے شروع میں ”✓“ کا نشان لگائیں۔

i- علامہ اقبالؒ نے پہلے خط میں مولانا گرامی کے لیے کیا القاب استعمال کیے؟

۱- جناب مولانا گرامی ب۔ حضرت مولانا گرامی ج۔ ڈیر مولانا گرامی

Review۔ تبصرہ

East and West

ii- علامہ اقبالؒ کی سادہ و محسوس کرتے تھے؟

ا۔ سر کا درد ب۔ پاؤں کا درد ج۔ پبلی کا درد

iii- ”اسرار خودی“ کا عربی میں ترجمہ کون کرانا چاہتا تھا؟

ا۔ ایک عرب ب۔ ایک ہندوستانی ج۔ ایک انگریز

iv- فسادات کس شہر میں ہو رہے تھے؟

ا۔ دہلی میں ب۔ لکھنؤ میں ج۔ کلکتہ میں

v- میاں ریاض صاحب نے مولانا گرامی کو کہاں آنے کی دعوت دی؟

ا۔ سیالکوٹ ب۔ لاہور ج۔ کراچی

2- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب دیں۔

i- علامہ اقبالؒ ”گورداس پور والے حکیم کی دوا سے مطمئن کیوں تھے؟

ii- پہلے خط میں علامہ اقبالؒ نے کن دعوتوں کا ذکر کیا ہے؟

iii- دوسرا خط کس شخصیت کے نام لکھا گیا ہے؟

iv- دوسرے خط میں علامہ اقبالؒ نے مکتوب الیہ سے کیا درخواست کی ہے؟

v- کس رسالے میں علامہ اقبالؒ کی دونوں مثنویوں پر رائے دی گئی؟

vi- علامہ اقبالؒ نے اکبر الہ آبادی کے اشعار کس رسالے میں پڑھے؟

vii- لاہور کی کس انجمن نے مولانا گرامی کو آنے کی دعوت دی؟

viii- علامہ اقبالؒ کو ایک عرب نے کس شہر سے خط لکھا؟

3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں۔

علیل۔ افاقہ۔ عمر خضر۔ ضعف و ناتوانی۔ میلانِ طبیعت۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ کے واحد لکھیں۔

حکام۔ حالات۔ آلام۔ افکار۔ اشعار۔

5- سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل پیرا گراف کی تشریح کریں۔

میں ابھی تک علیل ہوں..... خدا تعالیٰ کے فضل کا منتظر ہوں۔

لاہور کا جغرافیہ

تمہید:

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ لاہور کو دریافت ہوئے اب بہت عرصہ گزر چکا ہے، اس لیے دلائل و براہین سے اس کے وجود کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کہنے کی بھی اب ضرورت نہیں کہ کرے کو دائیں سے بائیں گھمائیے، حتیٰ کہ ہمارا ملک آپ کے سامنے آ کر ٹھہر جائے، پھر فلاں طول البلد اور فلاں عرض البلد کے مقام انقطاع پر لاہور کا نام تلاش کیجیے، جہاں یہ نام کرے پر مرقوم ہو، وہی لاہور کا محل وقوع ہے۔ اس ساری تحقیقات کو مختصر مگر جامع الفاظ میں بزرگ یوں بیان کرتے ہیں کہ لاہور، لاہور ہی ہے۔ اگر اس پتے سے آپ کو لاہور نہیں مل سکتا تو آپ کی تعلیم ناقص اور آپ کی ذہانت فاتر ہے۔

محل وقوع:

ایک دو غلط فہمیاں البتہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سر زمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بہنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لینا رہتا ہے، بہنے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔

لاہور تک پہنچنے کے کئی راستے ہیں لیکن دو ان میں سے بہت مشہور ہیں، ایک پشاور سے آتا ہے، دوسرا دہلی سے۔ وسطی ایشیا کے حملہ آور پشاور کے راستے اور یوپی کے حملہ آور دہلی کے راستے وارد ہوتے ہیں۔ اول الذکر اہل سیف کہلاتے ہیں اور غزنوی یا غوری تخلص کرتے ہیں۔ مؤخر الذکر اہل زبان کہلاتے ہیں۔ یہ بھی تخلص کرتے ہیں اور اس میں بد طولی رکھتے ہیں۔ (سپاہ و سپاہ)

حدود اربعہ:

کہتے ہیں کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ بھی ہوا کرتا تھا لیکن طلبہ کی سہولت کے لیے میونسپلٹی نے اسے منسوخ کر دیا ہے۔ اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے اور روز بروز واقع تر ہو رہا ہے..... ماہرین کا اندازہ ہے کہ دس بیس سال کے اندر لاہور ایک سو بے کا نام ہوگا جس کا دار الخلافہ پنجاب ہوگا۔ یوں سمجھیے کہ لاہور ایک جسم ہے جس کے ہر حصے پر ورم نمودار ہو رہا ہے لیکن ہر ورم مواد فاسد سے بھرا ہے۔ گویا یہ توسیع ایک عارضہ ہے جو اس کے جسم کو لاحق ہے۔

آب و ہوا:

لاہور کی آب و ہوا کے متعلق طرح طرح کی روایات مشہور ہیں جو قریباً سب کی سب غلط ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لاہور کے

باشندوں نے حال ہی میں یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ اور شہروں کی طرح ہمیں بھی آب و ہوا دی جائے۔ میونسپلٹی بڑی بحث و تمحیص کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ اس ترقی کے دور میں جبکہ دنیا میں کئی ممالک کو ہوم رول مل رہا ہے اور لوگوں میں بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں۔ اہل لاہور کی یہ خواہش ناجائز نہیں بلکہ ہمدردانہ غور و خوض کی مستحق ہے۔

لیکن بد قسمتی سے کمیٹی کے پاس ہوا کی قلت تھی۔ اس لیے لوگوں کو ہدایت کی گئی کہ مفاد عامہ کے پیش نظر اہل شہر ہوا کا بے جا استعمال نہ کریں بلکہ جہاں تک ہو سکے کفایت شعاری سے کام لیں۔ چنانچہ اب لاہور میں عام ضروریات کے لیے ہوا کی بجائے گرد اور خاص خاص حالات میں دھواں استعمال کیا جاتا ہے۔ کمیٹی نے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مہیا کرنے کے لیے مرکز کھول دیے ہیں جہاں یہ مرکبات مفت تقسیم کیے جاتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے نہایت تسلی بخش نتائج برآمد ہوں گے۔

بہم رسانی آب کے لیے ایک اسکیم عرصے سے کمیٹی کے زیر غور ہے۔ یہ اسکیم نظام سٹے کے وقت سے چلی آتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ نظام سٹے کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے اہم مسودات بعض تو تلف ہو چکے ہیں اور جو باقی ہیں ان کے پڑھنے میں بہت وقت پیش آرہی ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ تحقیق و تدقیق میں ابھی چند سال اور لگ جائیں۔ عارضی طور پر پانی کا یہ انتظام کیا گیا ہے کہ فی الحال بارش کے پانی کو حتی الوسع شہر سے باہر نکلنے نہیں دیتے، اس میں کمیٹی کو بہت کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے میں ہر محلے کا اپنا ایک دریا ہوگا جس میں رفتہ رفتہ مچھلیاں پیدا ہوں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں کمیٹی کی ایک انگوٹھی ہوگی جو رائے دہندگی کے موقع پر ہر رائے دہندہ پہن کر آئے گا۔

نظام سٹے کے مسودات سے اس قدر ضرور ثابت ہوا ہے کہ پانی پہنچانے کے لیے مل ضروری ہیں۔ چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے جا بجا مل لگوا دیے ہیں۔ فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن بھری ہے لیکن ماہرین کی رائے ہے کہ ایک نہ ایک دن یہ گیسیں ضرور مل کر پانی بن جائیں گی۔ چنانچہ بعض ملوں میں اب بھی چند قطرے روزانہ نکلتے ہیں۔ اہل شہر کو ہدایت کی گئی ہے کہ اپنے اپنے گھرے ملوں کے نیچے رکھ چھوڑیں تاکہ عین وقت پر تاخیر کی وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو۔ شہر کے لوگ اس پر بہت خوشیاں منارہے ہیں۔

ذرائع آمدورفت:

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں ان کو یہاں کے آمدورفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کما حقہ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ یہ آثار قدیمہ میں شمار ہوتی ہے اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس میں کسی قسم کا رد و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تختے الٹ دیے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمت رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

بعض لوگ زیادہ عبرت پکڑنے کے لیے ان تختوں کے نیچے کہیں کہیں دو ایک پیہ لگا لیتے ہیں اور سامنے دو ہک لگا کر ان میں ایک گھوڑا ٹانگ دیتے ہیں۔ اصطلاح میں اس کو ٹانگا کہتے ہیں۔ شوقین لوگ اس تختے پر موم جامہ منڈھ لیتے ہیں تاکہ پھسلنے میں سہولت ہو اور بہت زیادہ عبرت پکڑی جاسکے۔

ٹانگوں میں بنا پتی گھوڑے استعمال کیے جاتے ہیں۔ بنا پتی گھوڑا شکل صورت میں دُم دار ستارے سے ملتا ہے کیوں کہ اس گھوڑے کی ساخت میں دُم زیادہ اور گھوڑا کم پایا جاتا ہے۔ حرکت کے وقت اپنی دُم دبا لیتا ہے اور ضبط نفس سے اپنی رفتار میں ایک سنجیدہ اعتدال پیدا کرتا ہے تاکہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اور تانگے کا ہر ہچکولا اپنا نقش آپ پر ثبت کرتا جائے اور آپ کا ہر ایک مسام لطف اندوز ہو سکے۔

قابل دید مقامات:

لاہور میں قابل دید مقامات مشکل سے ملتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دُہری بنائی جاتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار کھڑی کرتے ہیں اور پھر اس پر اشتہاروں کا پلستر کر دیا جاتا ہے جو دبازت میں رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے۔ شروع شروع میں چھوٹے سائز کے مبہم اور غیر معروف اشتہارات چپکا دیے جاتے ہیں، مثلاً ”اہل لاہور کو مغرور“ یا ”اچھا سستا مال“۔ اس کے بعد ان اشتہاروں کی باری آتی ہے جن کے مخاطب اہل علم اور سخن فہم لوگ ہوتے ہیں مثلاً ”گر بیجیوے درزی ہاؤس یا ”سٹوڈنٹس کے لیے نادر موقع“ یا ”کہتی ہے ہم کو خلق خدا غائب کیا“ رفتہ رفتہ گھر کی چار دیواری مکمل ڈائریکٹری کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دروازے کے اوپر بوٹ پالش کا اشتہار ہے، دائیں طرف تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے، بائیں طرف حافظہ کی گولیوں کا بیان ہے، اس کھڑکی کے اوپر ”انجمن خدام ملت“ کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ عقبی دیوار پر سرکس کے تمام جانوروں کی فہرست ہے۔ یہ اشتہارات بڑی سرعت سے بدلتے رہتے ہیں اور ہر نیا مژدہ اور ہر نئی دریافت یا ایجاد یا انقلاب عظیم کی ابتدا چشم زدن میں ہر ساکن چیز پر لپ دی جاتی ہے اور ان کو پہچاننے میں خود شہر کے لوگوں کو بڑی دقت پیش آتی ہے۔

لیکن جب سے لاہور میں دستور رائج ہوا ہے کہ بعض بعض اشتہاری کلمات پختہ سیانی سے خود دیواروں پر نقش کر دیے جاتے ہیں، یہ وقت بہت حد تک رفع ہو گئی ہے۔ ان دائمی اشتہاروں کی بدولت اب یہ خدشہ باقی نہیں رہا کہ کوئی شخص اپنا یا اپنے دوست کا مکان صرف اس لیے بھول جائے کہ کچھلی مرتبہ وہاں چار پائیوں کا اشتہار لگا ہوا تھا اور لوٹنے وقت تک اہالیان لاہور کو تازہ اور ستے جوتوں کا مژدہ سنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ اب وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ جہاں بحرف جلی ”حمد علی دندان ساز“ لکھا ہے وہ اخبار انقلاب کا دفتر ہے۔ ”خالص گھی کی مٹھائی“ امتیاز علی تاج صاحب کا مکان ہے ”کرشنا بیوی کریم“ شالامار باغ کو اور ”کھانسی کا مجرب نسخہ“ جہانگیر کے مقبرے کو جاتا ہے۔

صنعت و حرفت:

اشتہاروں کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسالہ سازی ہے اور سب سے بڑی حرفت انجمن سازی ہے۔ ہر رسالے کا نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص موقعوں پر شائع کیے جاتے ہیں۔

لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک انجمن موجود ہے، پریذیڈنٹ البتہ تھوڑے ہیں۔ اس لیے فی الحال صرف دو تین اصحاب ہی یہ اہم فرض ادا کر رہے ہیں۔ چونکہ ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد مختلف نہیں اس لیے بسا اوقات ایک ہی صدر صبح کسی مذہبی کانفرنس کا افتتاح کرتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے ڈنر میں شامل ہوتا ہے۔ اس سے ان کا مطمع نظر وسیع رہتا ہے۔ تقریر عام طور پر ایسی ہوتی ہے جو دونوں موقعوں پر کام آ سکتی ہے۔ چنانچہ سامعین کو بہت سہولت رہتی ہے۔

پیداوار:

لاہور کی سب سے مشہور پیداوار یہاں کے طلبہ ہیں جو بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں دس اور کو بھیجے جاتے ہیں۔ فصل شروع سرما میں ہوئی جاتی ہے اور عموماً اواخر بہار میں پک کر تیار ہوتی ہے۔

طلبہ کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جن میں سے چند مشہور ہیں۔ قسم اول جمالی کہلاتی ہے۔ یہ طلبہ عام طور پر پہلے درزیوں کے ہاں تیار ہوتے ہیں، بعد ازاں دھوبی اور پھر نائی کے پاس بھیجے جاتے ہیں اور اس عمل کے بعد کسی ریسٹوران میں ان کی نمائش کی جاتی ہے۔

دوسری قسم جلالی طلبہ کی ہے۔ ان کا شجرہ جلال الدین اکبر سے ملتا ہے، اس لیے ہندوستان کا تخت و تاج ان کی ملکیت سمجھا جاتا ہے۔ شام کے وقت چند مہاجبوں کو ساتھ لیے نکلتے ہیں اور جو دوستا کے خم لہڑھاتے پھرتے ہیں۔ کالج کی خوراک انھیں راس نہیں آتی، اس لیے ہوٹل میں فروکش نہیں ہوتے۔

تیسری قسم خیالی طلبہ کی ہے۔ یہ اکثر روپ، اخلاق اور آواگون اور جمہوریت پر باواز بلند تبادلہ خیالات کرتے پائے جاتے ہیں اور آفرینش اور نفسیات کے متعلق نئے نئے نظریے پیش کرتے رہتے ہیں۔ صحت جسمانی کو ارتقائے انسانی کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے علی الصبح پانچ بجے ڈنر پلٹتے ہیں اور شام کو ہوٹل کی چھت پر گہرے سانس لیتے ہیں۔ گاتے ضرور ہیں لیکن اکثر بے سرے ہوتے ہیں۔

چوتھی قسم خالی طلبہ کی ہے۔ یہ طلبہ کی خالص ترین قسم ہے۔ ان کا دامن کسی قسم کی آلاش سے تر ہونے نہیں پاتا۔ کتابیں، امتحانات، مطالعہ اور اسی قسم کے خرنشے کبھی ان کی زندگی میں خلل انداز نہیں ہوتے۔ جس معصومیت کو لے کر وہ کالج میں پہنچے تھے، اسے آخر تک ملوث نہیں ہونے دیتے اور تعلیم اور نصاب اور درس کے ہنگاموں میں اس طرح زندگی بسر کرتے ہیں جس طرح بتیس دانٹوں میں زبان رہتی ہے۔

طبعی حالات:

لاہور کے لوگ بہت خوش طبع ہیں۔

(پطرس کے مضامین)

مشق

1- مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب لکھیں:

- i- میونسپلٹی نے ہوا کی قلت دور کرنے کے لیے کیا اقدامات کیے ہیں؟
- ii- لاہور میں بہم رسانی آب کے منصوبے کی تکمیل میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟
- iii- میونسپلٹی نے جابجائل لگا کر اہل لاہور کو کیا ہدایت کی ہے؟
- iv- لاہور کے بازاروں میں سے گزرنے والی سڑک کس نے بنوائی تھی؟
- v- تانگے کی ساخت مصنف کے الفاظ میں بیان کریں۔
- vi- ”لاہور کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں ڈھری بنائی جاتی ہیں“۔ وضاحت کریں۔
- vii- پختہ سیاسی کے اشتہارات کا فوری فائدہ کیا ہوا ہے؟
- viii- لاہور کی مشہور ترین پیداوار کیا ہے؟
- ix- طلبہ کی کتنی قسمیں ہوتی ہیں؟ صرف نام لکھیں۔
- x- طبعی حالات کے عنوان کے تحت اہل لاہور کی کس صفت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟

2- سبق کی مدد سے موزوں الفاظ کا انتخاب کر کے خالی جگہ پُر کیجیے:

- i- لاہور تک پہنچنے کے لیے..... راستے مشہور ہیں۔ (کئی۔ دو۔ تین)
 - ii- پنجاب اب..... دریاؤں کی سرزمین ہے۔ (ساڑھے چار۔ پانچ۔ سات)
 - iii- نصف دریا کو اصطلاح میں..... کہتے ہیں۔ (نہر۔ راوی۔ راوی ضعیف)
 - iv- لاہور میں بہم رسانی آب کے لیے ابتدائی منصوبہ..... نے بنایا۔ (شیر شاہ سوری۔ نظام۔ سقا۔ انگریزوں)
 - v- لاہور کے ہر مربع انچ میں ایک..... موجود ہے۔ (ہوٹل، انجمن، کالج)
- 3- تلخیص کا اصول ہے کہ وہ اصل عبارت کی قریب قریب ایک تہائی ہو اور عبارت کے تمام اہم نکات تلخیص میں شامل ہوں۔ عبارت کا ایک موزوں عنوان تجویز کرنا بھی ضروری ہے۔ ایک نمونہ درج ذیل ہے۔

عبارت:

ایک دو غلط فہمیاں الیہ ضرور رفع کرنا چاہتا ہوں۔ لاہور پنجاب میں واقع ہے لیکن پنجاب اب پنج آب نہیں رہا۔ اس پانچ دریاؤں کی سرزمین میں اب صرف ساڑھے چار دریا بہتے ہیں اور جو نصف دریا ہے وہ تو اب بننے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اس کو اصطلاح میں راوی ضعیف کہتے ہیں۔ ملنے کا پتا یہ ہے کہ شہر کے قریب دو پل بنے ہوئے ہیں۔ ان کے نیچے ریت میں یہ دریا لیٹا رہتا ہے، بننے کا شغل عرصے سے بند ہے۔ اس لیے یہ بتانا بھی مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں

مجوزہ عنوان:

لاہور کا جغرافیہ

تلخیص:

لاہور پنجاب میں واقع ہے جسے پنج آب نہیں کہا جاسکتا کیوں کہ راوی بہنا چھوڑ چکا ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ شہر دریا کے دائیں کنارے پر واقع ہے یا بائیں کنارے پر۔ (الفاظ: 35)

اب آپ مذکورہ بالا نمونے کی روشنی میں نیچے دی گئی سبقتی عبارت کی تلخیص کریں اور موزوں عنوان تحریر کریں۔

لاہور میں قابل دید..... بیان کر دیے گئے ہیں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

قلّت۔ قابل دید۔ خلل انداز۔ اغراض و مقاصد۔ تعارف۔ رد و بدل۔ دائمی۔ دریافت۔ جامع۔ منسوخ

5- متن اور سیاق و سباق کے حوالے سے مندرجہ ذیل پیرا گراف کی تشریح کریں۔

تمہید کے طور پر صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں..... آپ کی ذہانت فائز ہے۔

دوستی کا پھل

کسی جنگل میں ایک کبوتر اور کبوتری رہتے تھے۔ ایک بڑے سے درخت پر ان کا گھونسلہ تھا اور اس میں وہ دونوں امن چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ جب کبوتری نے گھونسلے میں انڈے دیے تو اسے ہر وقت اسی بات کی فکر لگی رہتی کہ:

”کہیں کوئی جانور انڈے نہ لے جائے۔“

یہی بات سوچتے ہوئے ایک روز وہ کبوتر سے کہنے لگی:

”ہمارا یہاں کوئی ایسا سنگی ساتھی نہیں ہے جو وقت پڑنے پر کام آسکے۔“

”لیکن تمہیں یہاں خطرہ کس بات کا ہے؟“

کبوتر نے حیرانی سے دریافت کیا۔ اس پر کبوتری اسے سمجھانے کے انداز میں بولی۔

”بڑا وقت کسی کو بتا کر نہیں آیا کرتا۔“

پھر اس نے قدرے سنجیدگی سے کہا:

”ہمیں اپنے ایک دوست ساتھی ضرور بنانے چاہئیں تاکہ مصیبت کے وقت وہ ہماری مدد کر سکیں۔“

کبوتری کی یہ بات سن کر کبوتر بھی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ کچھ سوچ کر کہنے لگا۔

”تمہاری بات اپنی جگہ درست ہے مگر مصیبت یہ ہے کہ یہاں ہماری برادری کا کوئی پرندہ بھی تو نہیں رہتا۔ پھر دوست بنائیں تو

کسے بنائیں؟“

کبوتری بولی:

”کوئی حرج نہیں۔ ہماری برادری کا کوئی پرندہ نہیں ہے تو نہ ہو۔ آخر کسی دوسری برادری کے پرندے یا جانور سے بھی تو تعلقات

قائم کیے جاسکتے ہیں؟“

”اکیلا جاندار دنیا میں کسی کام کا نہیں ہوتا۔ ہمیں کوئی نہ کوئی ساتھی ضرور بنالینا چاہیے۔“

سچ تو یہ ہے کہ کبوتری کی بات کبوتر کے دل کو لگ گئی تھی۔ آج تک اس کا اس طرف دھیان ہی نہ گیا تھا اور اب کبوتری کے کہنے پر

اسے بھی احساس ہونے لگا تھا کہ کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہونا چاہیے۔ وہ دل ہی دل میں اپنے ارد گرد کے قریبی علاقے کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہاں کون کون رہتا ہے؟ کچھ پرندے اس کے ذہن میں آئے لیکن وہ وہاں سے کافی فاصلے پر رہتے تھے۔ اس لیے ان سے

دوستی کرنا یا نہ کرنا برا بھلا کیونکہ وقت پڑنے پر انھیں اطلاع بھی نہیں کی جاسکتی تھی۔ سوچتے سوچتے کبوتر کو خیال آیا کہ جہاں وہ رہتے ہیں، اس سے ذرا آگے ایک دوسرے درخت پر گدھوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اس نے کبوتری سے کہا:

”قرب ہی ایک درخت پر گدھوں کا ایک جوڑا رہتا ہے۔ اگر تم کہو تو میں ان کے پاس جاؤں۔“ کبوتری جلدی سے بولی:

”اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟ ابھی جاؤ اور ان سے دوستی قائم کرو۔“

”مگر مجھے تو گدھوں سے ڈر لگتا ہے۔ ان کا ہم سے میل مشکل ہی معلوم ہوتا ہے۔“

کبوتر سوچ میں پڑ گیا لیکن کبوتری نے پھر اسے سمجھاتے ہوئے کہا:

”گدھ ہیں تو کیا ہے؟ ہیں تو پرندے؟ تم جا کر تو دیکھو۔“

”اچھا! تم کہتی ہو تو میں چلا جاتا ہوں۔“

کبوتر نے اتنا کہا اور اسی وقت اڑ کے گدھوں کے جوڑے کے پاس جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سلام دعا کی اور پھر بڑی اپنائیت سے کہنے لگا۔

”ہم سب ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور اس طرح ہمارا رشتہ سگوں جیسا ہے۔ پھر کیوں نہ ہم ایک دوسرے کے دوست بن جائیں؟“

اس پر گدھ قدرے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بولا۔

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمارے تو ماں جائے ہوتے ہیں۔ آپس کے دکھ سکھ میں شریک ہو کر ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں۔“

کبوتر نے انھیں بھی اپنا ہم خیال پایا تو بولا۔

”میں اسی لیے تم لوگوں کے پاس آیا ہوں کہ آج سے ہم دوست بن جائیں۔“

جواب میں گدھ بولا۔

”ہم تو آج سے ایک دوسرے کے دوست بن گئے ہیں مگر میری بات مانو تو ہم ایک اور کام کریں۔“

کبوتر نے پوچھا:

”وہ کیا؟“

جس پر گدھ نے بتایا۔

”یہاں قریب ہی ایک درخت کی کھوہ میں ایک سانپ رہتا ہے۔ اگر وہ بھی ہمارا دوست بن جائے تو پھر ہم خطرے سے بالکل

محفوظ ہو جائیں گے۔“

یہ تجویز کبوتر کو بھی پسند آئی۔ لہذا وہ بولا۔

”اگر یہ بات ہے تو چلو اس کے پاس چلتے ہیں۔ وہ سکتا ہے، وہ بھی ہمارا دوست بن جائے۔“

چنانچہ گدھ اور کبوتر دونوں سانپ کے پاس پہنچ گئے۔ سانپ کو اپنے آنے کا مقصد بتایا اور کہا۔

”یہ ٹھیک ہے کہ ہم تینوں مختلف برادری سے تعلق رکھتے ہیں مگر دوست بننے میں کیا حرج ہے؟“

”دوستی میں تو کوئی پابندی حائل نہیں ہوتی؟“

سانپ نے ان دونوں کی باتوں کو بڑے غور سے سنا، کچھ دیر تک لیٹنا ان پر سوچ بچار کرتا رہا اور پھر ان سے کہنے لگا۔

”دوستی بڑی مشکل ہوتی ہے۔ اس میں ایک دوسرے کے لیے جان قربان کرنا پڑتی ہے۔“

”تم ہمیں، ہر امتحان میں ثابت قدم پاؤ گے۔“

دونوں نے بیک زبان سانپ سے کہا۔ اس پر سانپ بولا:

”اگر یہ بات ہے تو مجھے تم دونوں کی دوستی منظور ہے۔ آج سے ہم تینوں دوست ہیں اور وقت پڑنے پر ایک دوسرے کی پوری

پوری مدد کریں گے۔“

”بالکل ایسا ہی ہوگا۔“

اس طرح کبوتر، گدھ اور سانپ کی دوستی ہو گئی۔ اب کبوتری مطمئن تھی کہ وہ اکیلے نہیں رہے۔ ان کے دوسرے ساتھی بھی ہیں۔

دن گذرتے گئے۔ کبوتری نے جوائنڈے دیے تھے، اب ان کی جگہ ننھے منے بچوں نے لے لی تھی۔ کبوتری اور کبوتر دن رات بچوں

کی دیکھ بھال اور حفاظت میں لگے رہتے۔ ایک روز ایک شکاری اس طرف آنکا۔ وہ صبح سے مارا مارا پھر رہا تھا لیکن کوئی شکار اس کے

ہاتھ نہیں لگا تھا۔ وہ اسی درخت کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا جس پر کبوتر اور کبوتری نے گھونسل بنا رکھا تھا۔ اس نے دل میں سوچا۔

”خالی ہاتھ گھر جانا اچھی بات نہ ہوگی۔ کیوں نہ کسی گھونسلے سے کسی جانور کے بچے ہی پکڑ کے لے چلوں۔ کچھ تو مل جائے گا۔“

اتنا سوچ کر اس نے ارد گرد سے درخت کا جائزہ لیا تو اسے اس پر ایک گھونسلہ دکھائی دیا۔ گھونسلہ دیکھ کر اس نے اپنے تجربے سے

اس کا اندازہ بھی کر لیا کہ گھونسلے میں کسی پرندے کے بچے بھی موجود ہیں۔ اس وقت شام ہونے کو آئی تھی اور آہستہ آہستہ چاروں طرف

اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ یہ دیکھ کر شکاری کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے سوچا۔

”اگر میں درخت کے نیچے آگ جلا دوں تو روشنی میں درخت پر گھونسلہ تلاش کرنے میں آسانی رہے گی۔“

اس نے ادھر ادھر سے چند سوکھی لکڑیاں اور گھاس پھوس جمع کی اور پھر ان میں آگ لگا کر الاؤ سا روشن کر دیا۔ اس کے بعد وہ

درخت پر چڑھنے کی تیاری کرنے لگا۔

ادھر درخت کے نیچے شکاری یہ تیاری کر رہا تھا اور ادھر درخت پر بیٹھے ہوئے کبوتر اور کبوتری یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ شکاری

کی نیت بھانپ گئے تھے اور اب اپنے بچوں کو بچانے کی ترکیبیں سوچ رہے تھے جو ابھی اتنے چھوٹے تھے کہ اڑ بھی نہ سکتے تھے۔
کبوتر کبوتری سے کہنے لگا۔

”میں ابھی اپنے دوستوں کو خبر کرتا ہوں اور انھیں جلد بلا کر لاتا ہوں۔“

اس پر کبوتری کہنے لگی۔

”یہ درست ہے کہ تم اپنے دوستوں کو بلا لاؤ گے اور یہ بھی ٹھیک ہے کہ وہ ہماری مدد کو آ بھی جائیں گے لیکن بہتر یہ ہے کہ پہلے ہم خود
کوشش کریں۔ ہو سکتا ہے، دوسروں کی مدد کے بغیر ہی یہ مصیبت ٹل جائے۔“

”میرا تو خیال ہے پہلے اپنے دوستوں کو خبر کر دینی چاہیے۔“

کبوتر نے اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا، جس پر کبوتری نے کہا:

”اگر کوئی اپنی مدد آپ نہ کرے تو دوسرے بھی اس کی مدد کو تیار نہیں ہوا کرتے۔ ہاں، اگر ہم اس کا مقابلہ کرنے میں ناکام ہو

جائیں تو پھر تم اپنے دوستوں کو ضرور بلا لانا۔ مگر پہلے ہمیں خود ہی کچھ کرنا چاہیے۔“

شکاری آگ جلا چکا تھا اور اب اس نے اس کی روشنی میں درخت پر چڑھنا شروع کر دیا تھا۔ کبوتری نے جب اسے درخت پر
چڑھتے ہوئے دیکھا تو کبوتر سے بولی۔

”اگر ہم آگ بجھا دیں تو شکاری اندھیرے میں ہمارا گھونسلانہیں ڈھونڈ سکے گا۔“

”مگر ہم آگ کیسے بجھا سکتے ہیں؟“

کبوتر قدرے فکر مند ہوتے ہوئے بولا۔

”تم آؤ تو سہی! ہم کوشش کرتے ہیں۔“

کبوتری نے اتنا کہا اور وہ دونوں بجلی کی سی تیزی سے اڑ گئے۔ قریب ہی دریا بہہ رہا تھا۔ ان دونوں نے دریا پر پہنچ کر اپنے پروں
میں پانی بھرا اور پھر آن کی آن میں واپس آ کر وہ پانی جلتی ہوئی آگ پر چھڑک دیا۔ وہ پھراڑے اور دوبارہ پانی لا کر آگ پر چھڑکا اور اس
طرح چند ہی لمحوں میں تین چار بار پانی لا کر انھوں نے آگ پر چھڑک دیا جس سے جلتی ہوئی آگ بجھ گئی۔

درخت پر چڑھتے ہوئے شکاری نے جب دیکھا کہ آگ بجھ گئی ہے اور اندھیرے میں گھونسلانہ تلاش کرنا مشکل ہے تو نیچے اتر کر اس
نے دوبارہ آگ جلائی اور پھر سے درخت پر چڑھنے لگا۔ ادھر کبوتر اور کبوتری نے جب دیکھا کہ آگ دوبارہ روشن ہو گئی ہے تو وہ پھر سے
بھاگے بھاگے دریا پر گئے اور پہلے کی طرح پروں میں پانی بھر بھر کر لا کر اس پر چھڑکنے لگے۔ اور اس طرح چند ہی لمحوں میں انھوں نے پھر
آگ بجھا دی۔

شکاری ایک بار پھر درخت پر چڑھتے چڑھتے رک گیا۔ کچھ اندھیرا بھی بڑھ چکا تھا اور روشنی کے بغیر درخت پر چڑھنا ممکن نہیں تھا۔

اسے آگ پر رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ یہ اپنے آپ بچھ کیسے جاتی ہے؟ وہ غصے میں کھولتا ہوا پھر درخت سے نیچے اتر اور ایک بار پھر ادھر ادھر سے لکڑیاں جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔ اس دفعہ اس نے موٹی موٹی لکڑیاں جمع کی تھیں تاکہ جلنے کے بعد آگ بجھ نہ سکے۔ کبوتر اور کبوتری نے جب یہ دیکھا کہ اس دفعہ کی آگ بجھانا ان کے بس کی بات نہیں تو وہ بہت گھبرائے۔ اب دوستوں کی مدد ضروری تھی چنانچہ کبوتری نے کبوتر سے کہا:

”اب دوستوں سے مدد لینے کا وقت آ گیا ہے۔“

”جلدی جاؤ اور اپنے گدھ دوست کو مدد کے لیے بلا لاؤ۔“

یہ سنتے ہی کبوتر آن کی آن میں گدھ کے جوڑے کے پاس پہنچا اور انھیں ساری بات بتا کر کہا:

”اب مجھے تم لوگوں کی مدد کی ضرورت ہے۔“

گدھ نے آؤ دیکھنا تاؤ۔ سارے کام چھوڑ کر کہا:

”چلو! ہم ابھی چلتے ہیں۔ دوستی کس روز کام آئے گی؟“

کبوتر گدھوں کے جوڑے کو ساتھ لے کر آیا تو انھوں نے دیکھا کہ آگ پوری طرح جل رہی تھی اور اس کی روشنی میں شکاری درخت پر چڑھ رہا تھا۔ دونوں گدھ کبوتر اور کبوتری کے ساتھ جلدی جلدی دریا پر گئے اور انھوں نے اپنے بڑے بڑے پروں میں پانی بھر کے لا کر آگ پر پھینکنا شروع کر دیا۔ اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے چند لمحوں میں جلتی ہوئی آگ بجھ گئی۔ یہ دیکھ کر شکاری تلملا کر رہ گیا۔ مصیبت یہ تھی کہ اب اندھیرا بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ شکاری بار بار درخت پر چڑھنے اترنے میں تھک چکا تھا۔ اس لیے اس نے دل میں سوچا۔

”اب آگ جلانا مشکل ہے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔ کیوں نہ رات یہیں بسر کر لوں۔ صبح آسانی سے بچے نکال کر لے چلوں گا۔“

یہ سوچ کر وہ درخت سے تھوڑی دور زمین پر کپڑا بچھا کر لیٹ گیا۔ کبوتر اور گدھ نے جب یہ دیکھا کہ شکاری وہیں پر رات بسر کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور سونے کی تیاری کرنے لگا ہے تو وہ جان گئے کہ اس کی نیت ٹھیک نہیں ہے۔ یہ صبح ضرور گھونسے میں سے بچے نکال کر لے جائے گا۔ یہ جان کر وہ کچھ دوسری ترکیبیں سوچنے لگے۔ کبوتری نے رائے دی۔

”میری مانو تو تم دونوں اپنے دوست سانپ کے پاس جاؤ۔ اس وقت وہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔“

”ہاں! وہ یقیناً اس وقت ہمارے کام آ سکتا ہے۔“

مادہ گدھ نے بھی کبوتری کی رائے پسند کی۔

کبوتر اور گدھ دونوں تھوڑی ہی دیر میں اپنے دوست سانپ کے پاس پہنچ گئے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے شروع سے آخر تک اسے ساری بات بتائی اور پھر کہا۔

”اس وقت شکاری وہیں سویا ہوا ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ وہ صبح ضرور بچے نکال کر لے جائے گا۔“

سانپ لیٹے لیٹے سوچنے لگا تو کبوتر بولا۔

”اب صرف تمھاری مدد ہی میرے بچوں کی زندگی بچا سکتی ہے۔“

”ہم اسی لیے تمھارے پاس آئے ہیں۔“ گدھ نے بھی کبوتر کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔ سانپ بڑے غور سے ان کی باتیں سن

کر کہنے لگا:

”تم لوگ گھبراؤ نہیں۔“

”اس وقت تم دونوں جاؤ، میں صبح سارا بندوبست کر لوں گا۔“

”جیسے تمھاری مرضی۔“

گدھ اور کبوتر نے کہا اور دونوں واپس گھونسلے میں آ گئے۔ وہاں آ کر انھوں نے کبوتری اور مادہ گدھ کو ساری بات بتائی اور کہا کہ

”سانپ نے ہمیں مدد کرنے کا یقین دلایا ہے۔ وہ ضرور اپنی دوستی نبھائے گا۔“

اس کے بعد وہ چاروں کے چاروں درخت پر بیٹھے بیٹھے صبح کا انتظار کرنے لگے۔

شکاری رات بھر بڑے مزے سے سویا اور جب صبح ہوئی تو وہ خوش خوش آنکھیں ملتا ہوا اٹھا کہ درخت پر چڑھ کر گھونسلے میں سے بچے نکالے اور اپنے گھر کی راہ لے۔ اس نے اٹھ کر اپنا سامان وغیرہ سمیٹا اور جوں ہی درخت پر چڑھنے کے لیے اس کے پاس گیا، اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ گھبراہٹ اور خوف میں اسے اپنا ہوش تک نہ رہا۔ اس کے تیر کمان کہیں تھے اور اب وہ اپنی جان بچانے کی فکر کر رہا تھا۔ اس نے دیکھا، جس درخت پر چڑھ کر اسے کبوتر کے گھونسلے سے بچے نکالنا تھے اس درخت کے تنے کے ارد گرد بہت بڑا سانپ لپٹا ہوا اسے دیکھ دیکھ کر پھٹکار رہا تھا۔ شکاری نے دل میں سوچا۔

”جس طرح بھی ہوا اپنی جان بچاؤ۔ بھاڑ میں جائے شکار۔“

وہ اپنا سارا سامان چھوڑ چھاڑ کر اٹے پاؤں ایسا بھاگا کہ پھر پلٹ کر نہ دیکھا۔

وہ دن اور آج کا دن اس شکاری کا کہیں پتا نہیں چل سکا لیکن کبوتر آج بھی سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور یہ سب کچھ ان کی دوستی کا نتیجہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی لوگ دوستی اور امن کے پیغام کے لیے کبوتر ہی استعمال کرتے ہیں۔

(پنجابی لوگ داستانیں)

مشق

1- مختصر جواب دیں:

- i- کبوتر، گدھ اور سانپ میں قدر مشترک کیا تھی؟
- ii- کبوتر، گدھ اور سانپ دوستی اور باہمی تعاون پر کیوں آمادہ ہوئے؟
- iii- شکاری کا کردار، کس بات کی علامت ہے؟
- iv- کسی بیرونی خطرے کی صورت میں ہمیں کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟
- v- پڑوسیوں سے تعلقات کی نوعیت کیا ہونی چاہیے؟
- vi- معاشرے کی بقا کے لیے امداد باہمی کی کیا اہمیت ہے؟
- vii- کبوتر کو کس بات کی علامت قرار دیا جاتا ہے؟
- viii- اپنی مدد آپ کے اصول کی اہمیت، کہانی کی مدد سے بیان کیجیے۔

2- ”دوستی کا پھل“ کا خلاصہ لکھیے۔

3- مندرجہ ذیل الفاظ کا مفہوم لکھیے:

سنگی، قدرے، سنجیدگی، برادری، حامل، فکر۔

نوٹ: لوک داستان، مقامی یا علاقائی زبان کی ایسی کہانی کو کہا جاتا ہے جو دوستی، ایثار، خلوص، ہمدردی، رحم، شجاعت، عدل، فرض شناسی، بہادری، جذبہ حریت اور محبت جیسی اعلیٰ اخلاقی اقدار کی حامل ہو۔ ایسی کہانی نسل در نسل سنائی جاتی ہے اور لوک حافظے کا حصہ بنتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ صدیوں بعد لوک داستان کا درجہ اختیار کر لیتی ہے۔

آپ کوئی ایسی لوک کہانی لکھیں، جس کا عنوان ”نا اتفاق کا انجام“ ہو اور ٹیوٹوریل گروپ میں سنائیں۔

کیا واقعی دنیا گول ہے؟

ہم اس دھرتی کا گز بنے اور بحر ظلمات میں گھوڑے دوڑائے لیکن ہمیں تو ہر چیز چھٹی ہی نظر آئی۔ دنیا سے زیادہ تو ہم خود گول ہیں کہ پینٹنگ سے لڑھکے تو پیرس پہنچ گئے اور کوپن ہیگن سے پھسلے تو کولمبو میں آکر رُک کے بلکہ جا کر تال پہنچ کر دم لیا۔ دنیا کے گول ہونے پر اصرار کرنے والوں کا کہنا ہے کہ یقین نہ ہو تو مشرق کی طرف سے جاؤ، چکر کاٹ کر مغرب کی طرف سے پھر اپنے تھان پر آکر کھڑے ہو گے۔ اس میں ہمیں ہمیشہ ایک بدیہی خطرہ نظر آیا کہ کہیں گولائی کی طرف ریگتے ہوئے نیچے نہ گر پڑیں کیونکہ ہم کوئی چھپکلی تھوڑا ہی ہیں۔

اس لڑکے کا قصہ آپ نے سنا ہوگا کہ آدھ سیر تیل لینے کے لیے کنوڑا لے کر گیا تھا۔ کنوڑا تھا چھوٹا، بھر گیا تو دکاندار نے کہا کہ ”باقی کس چیز میں ڈالوں؟“۔ بر خوردار نے کنوڑا اوندھا کر کے کہا۔ ”ادھر پیندے کے حلقے میں ڈال دو“۔ پیندا اوپر کر کے گھر گیا تو ماں نے کہا: ”بیٹے میں نے آدھ سیر تیل لانے کو کہا تھا۔ بس اتنا سا؟ بس یہی؟“ اس دانشمند نے اُسے بھی الٹا کر کہا ”ادھر بھی تو ہے“۔

ہم سوچتے ہیں کہیں ایسا نہ ہو مشرق ہاتھ میں رہے، نہ مغرب۔ کیا عجب سندباد کی طرح کسی نادیدہ جزیرے میں جا نکلیں جہاں کسی پیرتئمہ پاسے مڈبھیڑ کا بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا کسی شہزادی مہر افروز کے سم پر جان سے عاشق ہونے کا۔ بلکہ پہلا امکان کچھ زیادہ ہی ہے۔ تاہم اے دوستو! اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو ہم دنیا کے گول ہونے کا ثبوت لینے کو چل دیے۔ گھر سے نکل پڑے جیسے حاتم طائی منیر شامی کی محبوبہ کی فرمائش پر انڈے کے برابر موتی اور کوہِ ندا کی تلاش میں نکل گیا تھا۔ کل صبح ہم کراچی میں تھے، دوپہر ڈھاکہ کے میں۔ رات ہماری بنکاک میں گزری اور دم تحریر سنگاپور میں ہیں۔ ان سطور کے زیور طبع سے آراستہ ہونے تک جانیے

کونی وادی میں ہو ، کونی منزل میں ہو

عشق بلا خیز کا قافلہ سخت جاں

رشتک آتا ہے کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں کہ کبھی قید مقام سے نہیں گزرتے۔ گویا نواں لہ تک گئے بھی تو دوسرے روز گھر لوٹ آئے۔ ہم سے پوچھیے جو مزا اور تھل لٹل کا کرتا ہیں، قوام والا پان کٹے میں دبا، ٹانگ پر ٹانگ دھرے گھر میں ”داستان امیر حمزہ“ پڑھنے اور لمبی تان کر سونے میں ہے وہ جگہ جگہ مارے مارے پھرنے میں کہاں، قیام کی راحتیں اور برکتیں کہاں تک بیان کی جائیں۔ نہ پاسپورٹ کی فکر نہ ویزا کے لیے بھاگ دوڑ۔ نہ فارن ایئر لائن کا ٹکٹ، نہ ہوائی کمپنیوں کے دفتر کے پھیرے کہ بھائی ایک سواری ہم بھی ہیں۔ بھالو۔ ہمیں کہیں چندے قیام کا تجربہ ہو تو ایسا زبردست قیام نامہ لکھیں کہ لوگ حریفوں کے سفر ناموں کو بھول جائیں۔ اے ناظرین! کبھی سفر کا ارادہ نہ کرنا۔ اجنبی دیسوں میں جگہ جگہ کے خطرات ہوتے ہیں۔ ٹیکسی والے ہیں، چور اُچکے ہیں، سامان لوٹنے والے، صبر و قرار لوٹنے والے وغیرہ۔

قلی وغیرہ قسم کی چیز بھی باہر کے ملکوں میں کم ہی ملتی ہے۔ انسان کو اپنے سوٹ کیس اور لپچیوں کے علاوہ اپنے ناز بھی بالعموم خود ہی اٹھانے پڑتے ہیں۔

اوکراچی یونیورسٹی والوانہ دو میں ڈاکٹر کی ڈگری۔ ہم ڈاکٹر ہو ہی گئے۔ یہاں کے لوگوں کا ہمیں ڈاکٹر انشا کہتے ہوئے منہ سوکتا ہے۔ ہم بھی اپنے دستخط کرتے ہوئے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا نہیں بھولتے۔ اجمال اس تفصیل کا یہ ہے کہ ہم جس قافلہ سخت جاں میں سفر کر رہے ہیں، ان میں بھی کچھ ترک ہیں، کچھ ایرانی، قریب قریب سبھی ڈاکٹر، پاکستانیوں میں فضل الباری صاحب وزیر صحت ہیں یعنی ڈاکٹروں کے بھی ڈاکٹر۔ مسئلہ فقط بیگم وجیہہ ہاشمی کا تھا کہ اپولہ کی انٹرنیشنل سیکرٹری ہیں اور اسلام آباد کی رہنے والی ہیں یا پھر ہمارا۔ لوگوں سے تعارف میں بڑی دقت ہوتی تھی۔ آخر ایک مختصر سی اور سنجیدہ سی کنوینشن میں ہم نے انھیں اعزازی ڈاکٹر کی ڈگری پیش کی اور انھوں نے ہمیں ڈاکٹرٹ کے خریطے سے نوازا۔ انھیں اتنی دواؤں کے نام یاد ہیں اور ان کے نسخے کہ ڈاکٹر بھی ان کے تلمذ میں فخر محسوس کریں۔ لہذا ان کی ڈاکٹری بے غل و غش چل جاتی ہے۔ ہم میڈیکل ڈاکٹروں کے سامنے علم و ادب کے ڈاکٹر بنتے ہیں اور کوئی ادب و فلسفہ کا سوال کر بیٹھے تو میڈیکل ڈاکٹر ہونے کا عذر کرتے ہیں۔ ایک بزرگ نے دونوں طرح کے سوالات شروع کر دیے تو ہمیں ہومیو پیتھی میں امان ملی اور ہمیں اس کے فضائل پر تقریر کرنی پڑی۔ ایک بار تو دانتوں کا ڈاکٹر بھی بننا پڑا اور ڈاکٹر طیب محمود کی بتائی ہوئی اصطلاحیں کام آگئیں۔ بہر حال ہم پہلے سے بتائے دیتے ہیں کہ ہم اور ڈاکٹر وجیہہ ہاشمی پاکستان لوٹیں تو ہمیں باقاعدہ ڈاکٹر کہ کر بلایا جائے۔ جب دوسرے ملکوں کے لوگوں نے قبول کر لیا ہے تو ہمارے پیارے ہم وطنوں کو اس پر ہرگز اعتراض نہ ہونا چاہیے۔

(دنیا گول ہے)

مشق

1- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ”کیا واقعی دنیا گول ہے؟“ کے مصنف کا نام کیا ہے؟

ا۔ پطرس بخاری ب۔ ابن انشا ج۔ مشتاق احمد یوسفی د۔ کرنل محمد خان

ii- مصنف نے کس شہر میں جا کر دم لیا؟

ا۔ پیکنگ ب۔ کوپن ہیگن ج۔ جا کرتا د۔ کولمبو

iii- لڑکے کے ہاتھ میں کیا تھا؟

ا۔ پیالا ب۔ گلاس ج۔ پلیٹ د۔ کٹورا

vi- جب مصنف مضمون لکھ رہا تھا تو وہ کس شہر میں تھا؟

ا۔ بنکاک ب۔ کولمبو ج۔ سنگاپور د۔ کراچی

2- مختصر جواب دیں۔

- i- کیا دنیا واقعی گول ہے؟
 - ii- حاتم طائی کیا تلاش کرنے نکلا تھا؟
 - iii- مصنف کے ساتھیوں کا تعلق کس ملک سے ہے؟
 - iv- فضل الباری کون تھے؟
 - v- مصنف کے ہم وطنوں کو اس کے ڈاکٹر کہلوانے پر کیوں اعتراض نہیں کرنا چاہیے؟
- 3- ”کیا واقعی دنیا گول ہے؟“ کا خلاصہ لکھیں۔
- 4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معنی لکھیں۔
- اصرار، بدیہی، پیرتسمہ پا، دم تحریر، زیر طبع
- 5- کالم (الف) کا ربط کالم (ب) سے جوڑیں اور درست جواب کو کالم (ج) میں لکھیں۔

کالم (ج)	کالم (ب)	کالم (الف)
	جگہ جگہ کے خطرات ہوتے ہیں۔	دھرتی کا
	کون سی منزل میں ہو	بحر ظلمات میں
	کٹورا لے کر گیا تھا	کبھی سفر کا
	ارادہ نہ کرنا	اجنبی دیوں میں
	گھوڑے دوڑائے	کون سی وادی میں ہو،
	گزر بنے	

- 6- مندرجہ ذیل الفاظ کے متضاد لکھیں:
- دھرتی، ماں، قیام، بالعموم، باقاعدہ۔
- 7- خالی جگہ پر کریں:
- i- ہمیں ہمیشہ ایک ہی بدیہی خطرہ..... آیا۔
 - ii- برخوردارنے..... اوندھا کر کے کہا۔
 - iii- اے دوستو! اب کیا ہو..... ہے۔
 - iv- ہم ڈاکٹر ہو ہی.....
 - v- ہم میڈیکل ڈاکٹروں کے سامنے علم و ادب کے..... بنتے ہیں۔
- 8- سیاق و سباق کے حوالے سے تشریح کریں:
- رشک آتا ہے کہ..... حریفوں کے سفر ناموں کو بھول جائیں۔

اور آنا گھر میں مرغیوں کا

عرض کیا ”کچھ بھی ہو۔ میں گھر میں مرغیاں پالنے کا روادار نہیں۔ میرا راسخ عقیدہ ہے کہ ان کا صحیح مقام پیٹ اور پلیٹ ہے اور شاید.....“ ”اس راسخ عقیدے میں میری طرف سے پتیلی کا اور اضافہ کر لیجیے۔“ انھوں نے بات کاٹی۔ پھر عرض کیا ”اور شاید یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی مرغی عمر طبعی کو نہیں پہنچ پاتی۔ آپ نے خود دیکھا ہوگا کہ ہماری ضیافتوں میں میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ مرغیوں اور مہمانوں کی تعداد اور ان کے تناسب سے لگایا جاتا ہے۔“

فرمایا ”یہ صحیح ہے کہ انسان روٹی پر ہی زندہ نہیں رہتا..... اسے مرغ مسلم کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ اگر آپ کا عقیدہ ہے کہ خدا نے مرغی کو محض انسان کے کھانے کے لیے پیدا کیا تو مجھے اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ صاحب! مرغی تو درکنار، میں تو انڈے کو بھی دنیا کی سب سے بڑی نعمت سمجھتا ہوں۔ تازے خود کھائیے۔ گندے ہو جائیں تو ہوطلوں اور سیاسی جلسوں کے لیے ڈگنے داموں بچے۔ یوں تو اس میں..... میرا مطلب ہے تازہ انڈے میں

ع ہزاروں خوبیاں ایسی کہ ہر خوبی پہ دم نکلے مگر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ پھو ہڑ سے پھو ہڑ عورت کسی طرح بھی پکائے یقیناً مزے دار کپکے گا۔ آلیٹ، نیم برشت، تلا ہوا حلوا.....“ اس کے بعد انھوں نے ایک نہایت پیچیدہ اور گنجلک تقریر کی جس کا ماحصل یہ تھا کہ آلیٹ وغیرہ بگاڑنے کے لیے غیر معمولی سلیقہ اور صلاحیت درکار ہے جو نئی زمانہ مفقود ہے۔

اختلاف کی گنجائش نظر نہ آئی تو میں نے پہلو بچا کر وار کیا ”یہ سب درست! لیکن اگر مرغیاں کھانے پر اتر آئے تو ایک ہی ماہ میں دڑبے کے دڑبے صاف ہو جائیں گے۔“ کہنے لگے ”یہ نسل منائے نہیں ملتی۔ جہاں تک اس جنس کا تعلق ہے دو اور دو چار نہیں بلکہ چالیس ہوتے ہیں۔ یقیناً نہ آئے تو خود حساب کر کے دیکھ لیجیے۔ فرض کیجیے کہ آپ دس مرغیوں سے مرغبانی کی ابتدا کرتے ہیں۔ ایک اعلیٰ نسل کی مرغی سال میں او۔ طاد دوسو سے ڈھائی سو تک انڈے دیتی ہے لیکن آپ چونکہ فطرتاً قنوطی واقع ہوئے ہیں، اس لیے یہ مانے لیتے ہیں کہ آپ کی مرغی صرف ڈیڑھ سو انڈے دے گی۔“

میں نے ٹوکا ”مگر میری قنوطیت کا مرغی کے انڈے دینے کی صلاحیت سے کیا تعلق؟“ بولے ”بھئی آپ تو قدم قدم پر الجھتے ہیں۔ قنوطی سے ایسا شخص مراد ہے جس کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے آنکھیں رونے کے لیے بنائی ہیں۔ خیر، اس کو جانے دیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ اس حساب سے پہلے سال میں ڈیڑھ ہزار انڈے ہوں گے اور دوسرے سال ان انڈوں سے جو مرغیاں نکلیں گی وہ دو لاکھ پچیس ہزار انڈے دیں گی جن سے تیسرے سال اسی محتاط اندازے کے مطابق تین کروڑ سینتیس لاکھ پچاس ہزار چوزے نکلیں

گے۔ بالکل سیدھا سا حساب ہے۔“

”مگر یہ سب کھائیں گے کیا؟“ میں نے بے صبری سے پوچھا۔ ارشاد ہوا اس کی خوبی یہی ہے کہ اپنا رزق آپ تلاش کرتا ہے۔ آپ پال کر تو دیکھیے۔ دانہ دُنکا، کیڑے مکوڑے، کنکر پتھر چمک کے اپنا پیٹ بھر لیں گے۔“

پوچھا ”اگر مرغیاں پالنا اس قدر آسان اور نفع بخش ہے تو آپ اپنی مرغیاں مجھے کیوں دینا چاہتے ہیں۔“ فرمایا ”یہ آپ نے پہلے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔ ناحق رُذوق کی۔ آپ جانتے ہیں کہ میرا مکان پہلے ہی کس قدر مختصر ہے۔ آدھے میں ہم رہتے ہیں اور آدھے میں مرغیاں۔ اب مشکل یہ آ پڑی ہے کہ کل کچھ عزیز چھٹیاں گزارنے آرہے ہیں۔ اس لیے.....“

اور دوسرے دن ان کے نصف مکان میں عزیز اور ہمارے گھر میں مرغیاں آ گئیں۔

اب اس کو میری سادہ لوحی کہیں یا خلوص نیت کہ شروع شروع میں میرا خیال تھا کہ انسان محبت کا بھوکا ہے اور جانور اس واسطے پالتا ہے کہ اپنے مالک کو پہچانے اور اس کا حکم بجالائے۔ گھوڑا اپنے سوار کا آسن اور ہاتھی اپنے مہات کا آکنس پہچانتا ہے۔ کتا اپنے مالک کو دیکھتے ہی دُم ہلانے لگتا ہے جس سے مالک کو روحانی خوشی ہوتی ہے۔ سانپ بھی سپرے سے ہل جاتا ہے لیکن مرغیاں؟ میں نے آج تک کوئی مرغی ایسی نہیں دیکھی جو کسی اور کو پہچانے اور جس کو اپنے پرانے کی تمیز ہو۔ مہینوں ان کی نگہداشت اور سنبھال کیجیے۔ برسوں ہتھیلیوں پر چگائے۔ لیکن کیا مجال کہ آپ سے ذرا بھی مانوس ہو جائیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ میں یہ اُمید لگائے بیٹھا ہوں کہ میرے دہلیز پر قدم رکھتے ہی مرغ سرس کے طوطے کی مانند توپ چلا کر سلامی دیں گے یا چوزے میرے پاؤں میں وفادار کتے کی طرح لویں گے، اور مرغیاں اپنے اپنے انڈے ”سپر دم بتو مایہ خویش را“ کہتی ہوئیں مجھے سوئپ کر اُلٹے قدموں واپس چلی جائیں گی۔ تاہم پالتو جانور سے خواہ وہ شرعاً حلال ہی کیوں نہ ہو، یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ ہر چمکتی ہوئی چیز کو چھری سمجھ کر بدکنے لگے اور مہینوں کی پرورش و پرداخت کے باوجود محض اپنے جہلی تعصب کی بنا پر ہر مسلمان کو اپنے خون کا پیا سا تھوکر کرے۔

ایک عام خوش فہمی جس میں تعلیم یافتہ اصحاب بالعموم اور اُردو شعرا بالخصوص عرصے سے مبتلا ہیں، یہ ہے کہ مرغ صرف صبح اذان دیتے ہیں۔ اٹھارہ مہینے اپنی عادات و خصائل کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یا تو میں جان بوجھ کر عین اس وقت سوتا ہوں جو قدرت نے مرغ کے اذان دینے کے لیے مقرر کیا ہے یا یہ ابد اکراس وقت اذان دیتا ہے جب خدا کے گناہگار بندے خواب غفلت میں پڑے ہوں۔ بہر صورت ہمارے محبوب ترین اوقات اتوار کی صبح اور سہ پہر ہیں۔ آج بھی چھوٹے قصبوں میں کثرت سے ایسے خوش عقیدہ حضرات مل جائیں گے جن کا ایمان ہے کہ مرغ باغک نہ دے تو پونہیں پھنکتی لہذا کفایت شعار لوگ الارم والی ٹائم پیس خریدنے کے بجائے مرغ پال لیتے ہیں تاکہ ہمسایوں کو سحر خیزی کی عادت رہے۔ بعضوں کے گلے میں قدرت نے وہ سحر جلال عطا کیا ہے کہ نیند کے ماتے تو ایک طرف رہے، ان کی باغک سُن کر ایک دفعہ تو مردہ بھی کفن پھاڑ کے اکڑوں بیٹھ جائے۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ دوسرے جانوروں کے مقابلے میں مرغ کی آواز، اس کی جسامت کے لحاظ سے کم از کم سو گنا زیادہ ہوتی ہے۔

میں اپنی دولت آپ کے سپرد کرتا ہوں۔

میرا خیال ہے کہ اگر گھوڑے کی آواز بھی اسی تناسب سے بنائی گئی ہوتی تو تاریخی جنگوں میں توپ چلانے کی ضرورت پیش نہ آتی۔

اب یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ آخر مرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ ہم پرندوں کی نفسیات کے ماہر نہیں۔ البتہ معشر بزرگوں سے سنتے چلے آئے ہیں کہ صبح دم چڑیوں کا چہچہانا اور مرغ کی اذان دراصل عبادت ہے لہذا جب مرزا عبد اللہ دود بیگ نے ہم سے پوچھا کہ مرغ اذان کیوں دیتا ہے؟ تو ہم نے سیدھے سبھاؤ یہی جواب دیا کہ اپنے رب کی حمد و ثنا کرتا ہے۔ کہنے لگے ”صاحب! اگر یہ جانور واقعی اتنا عبادت گزار ہے تو لوگ اسے اتنے شوق سے کیوں کھاتے ہیں؟“

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ تھکا ماندہ بارش میں شرابور گھر پہنچا تو دیکھا کہ تین مرغے میرے پلنگ پر ہیں۔ سفید چادر پر جا بجا پتھوں کے تازہ نشان تھے۔ البتہ میری قبل از وقت واپسی کے سبب جہاں جہاں جگہ خالی رہ گئی وہاں سفید دھبے نہایت بد نما معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے ذرا درشتی سے سوال کیا ”آخر یہ گلا پھاڑ پھاڑ کے کیوں چیخ رہے ہیں؟“

بولیں ”آپ تو خواہ مخواہ الرجک ہو گئے ہیں۔ یہ پیارے چونچ بھی کھولیں تو آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے چڑا رہے ہیں؟“ میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ دل نے کہا ”بس بہت ہو چکا۔ آؤ آج دو ٹوک فیصلہ ہو جائے۔ اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں“ میں نے پھر کر کہا۔ ان کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو بھر آئے۔ ہر اسماں ہو کر کہنے لگیں ”میںہ برستے میں آپ کہاں جائیں گے؟“ اس جنس کے بارے میں ایک مایوس کن انکشاف یہ بھی ہوا کہ خواہ آپ موتی چگائیں، خواہ سونے کا نوا لکھائیں، مگر اس کو کیڑے مکوڑے، جھینگر، بھنگے، چوونٹے اور کیچوے کھانے سے باز نہیں رکھ سکتے اور میں یہ باور کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اس کا اثر و نفوذ اندے میں نہ ہو..... پھر مویں ہاں کے ایک افسانے کا ہیرا اگر یہ دعویٰ کرے کہ وہ زردی کی بو سے یہ بتا سکتا ہے کہ مرغی نے کیا کھایا تھا، تو اچھنبھ کی بات نہیں۔ خود ہمارے ہاں ایسے ایسے لائق قیافہ شناس دال روٹی پر جی رہے ہیں جو ذرا سی بوٹی چکھ کے بکری کے چارے کا مفصل حال بتا سکتے ہیں۔ آپ نے سنا ہوگا کہ کھلی اور بھوسہ کی خاصیت اور چوپایوں کی خصلت کے پیش نظر، بعض نفاست پسند والیان ریاست اس بات کا بڑا خیال رکھتے تھے کہ جن بھینسوں کے دودھ کی بالائی ان کے دسترخوان پر آئے، ان کو صبح و شام بادام اور پستے کھلائے جائیں تاکہ اس کا اصل ذائقہ اور مہک بدل جائے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں عمدہ دودھ کی خوبی یہ تھی کہ اسے پی کر کوئی یہ نہ کہ سکے کہ یہ دودھ ہے۔

ایک اور سنگین غلط فہمی جس میں خواص و عوام مبتلا ہیں اور جس کا ازالہ میں رفاہ عام کے لیے نہایت ضروری خیال کرتا ہوں، یہ ہے کہ مرغیاں دڑ بے اور ٹاپے میں رہتی ہیں۔ میرے ڈیڑھ سال کے مختصر مگر بھرپور تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ مرغیاں دڑ بے کے سوا ہر جگہ نظر آتی ہیں اور جہاں نظر نہ آئیں وہاں اپنے در و دروزول کا ناقابل تردید ثبوت چھوڑ جاتی ہیں۔ ان آنکھوں نے بارہا غسل خانے سے اندے اور کتابوں کی الماری سے جیتے جاگتے چوزے نکلتے دیکھے۔ لحاف سے کڑک مرغی اور دڑ بے سے شیو کی پیالی برآمد ہونا روزمرہ کا معمول ہو گیا اور یوں بھی ہوا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی اور میں نے لپک کر ریسور اٹھایا۔ مگر میرے ”ہیلو“ کہنے سے پیشتر ہی مرغ نے میری ٹانگوں کے درمیان کھڑے ہو کر اذان دی اور جن صاحب نے ازراہ تملطف مجھے یاد فرمایا تھا انھوں نے ”سوری! راگ نمبر!“ کہہ کر جھٹ فون بند کر دیا۔ قصہ مختصر چند ہی مہینوں میں اس طائر لاہوتی نے گھر کا وہ نقشہ کر دیا کہ اسے دیکھ کر وہی شعر پڑھنے کو جی چاہتا تھا، جو

قدرے مختلف حالات میں، کُنا پری نے حاتم طائی کو سُنا یا تھا:

یہ گھر جو کہ میرا ہے تیرا نہیں
پر اب گھر یہ تیرا ہے میرا نہیں

اب گھر اچھا خاصا پولٹری فارم (مرغی خانہ) معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ پولٹری فارم میں عام طور سے اتنے آدمیوں کے رہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جو حضرات آلام دنیوی سے عاجز و پریشان رہتے ہوں، ان کو میرا خلاصہ مشورہ ہے کہ مرغیاں پال لیں۔ پھر اس کے بعد پردہ غیب سے کچھ ایسے نئے مسائل اور فتنے خود بخود اٹھ کھڑے ہوں گے کہ انھیں اپنی گزشتہ زندگی جنت کا نمونہ معلوم ہوگی۔
(چراغ تلے)

مشق

- 1- درست جواب کے گرد دائرہ لگائیں۔
i- مصنف کے خیال میں مرغی کا صحیح مقام کیا ہے؟
(کھیت، ڈربہ، پلیٹ)
ii- میزبان کے اخلاص و ایثار کا اندازہ کن باتوں سے ہوتا ہے؟
(تحفے سے، طویل قیام سے، دسترخواں پر مرغیوں کی تعداد سے)
iii- گندے انڈوں کا موزوں محل استعمال کیا ہے؟
(جلہ، ٹوکری، کرکٹ میچ)
iv- مرغ کی آواز اور جسامت میں کیا تناسب ہے؟
(ایک اور دو کا، ایک اور چالیس کا، ایک اور سو کا)
- 2- سبق کے حوالے سے مختصر جوابات لکھیں۔ جواب تین سطور سے زیادہ طویل نہ ہو۔
i- مصنف کے دوست اپنی مرغیاں، مصنف کو کیوں دینا چاہتے تھے؟
ii- کفایت شعار لوگ مرغ کیوں پالتے ہیں؟
iii- ”اس گھر میں اب یا تو یہ رہیں گے یا میں!“ یہ جملہ مصنف نے کس موقع پر کہے کہا اور نتیجہ کیا نکلا؟
iv- مرغیوں کی پسندیدہ خوراک کیا ہے؟
v- ”سوری! راگ نمبر“ سے مصنف کا جو تجربہ وابستہ ہے، بیان کیجیے۔
3- مندرجہ ذیل عبارات کی تشریح، حوالہ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ کریں۔
i- مہینوں ان کی..... پیاسا تصور کرے۔

ii- ایک عام خوش چہی..... غفلت میں پڑے ہوں۔

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

پردہ غیب، راسخ عقیدہ، عمر طبعی، کنجاش، خوش چہی۔

5- مناسب الفاظ لگا کر خالی جگہ پُر کریں:

i- میں گھر میں..... پالنے کا روادار نہیں۔

ii- انسان صرف روٹی پر ہی..... نہیں رہتا۔

iii- اختلاف کی..... نظر نہ آئی۔

iv- انسان محبت کا..... ہے۔

v- مرغ صرف صبح..... اذان دیتے ہیں۔

۱۱-
۱۲-
۱۳-
۱۴-
۱۵-
۱۶-
۱۷-
۱۸-

حصہ نظم

حمد

دوسرا کون ہے ، جہاں تو ہے
لاکھ پردوں میں ہے تو بے پردہ
تو ہے خلوت میں، تو ہے جلوت میں
نہیں تیرے سوا، یہاں کوئی
رنگ تیرا، چمن میں بو تیری
کون جانے چُکھے ، کہاں تو ہے
سو نشانوں پہ، بے نشان تو ہے
کہیں پنہاں، کہیں عیاں تو ہے
میزباں تو ہے، مہماں تو ہے
خوب دیکھا تو باغباں تو ہے

محرم راز تو بہت ہیں امیر
جس کو کہتے ہیں راز داں ، تو ہے

مشق

- 1- ”حمد“ کے متن کو مد نظر رکھتے ہوئے نیچے دیے گئے ہر سوال کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔
 - i- ایسی نظم جس میں اللہ تعالیٰ کی تعریف کی جائے اسے کیا کہتے ہیں؟
 ا۔ حمد
 ب۔ نعت
 ج۔ منقبت
 د۔ قصیدہ
 - ii- یہ ”حمد“ کس شاعر کی تخلیق ہے؟
 ا۔ مولانا ظفر علی خاں
 ب۔ امیر مینائی
 ج۔ بہزاد لکھنوی
 د۔ ماہر القادری
- 2- ہر شعر کے آخر میں آنے والے ہم آواز اور ہم وزن الفاظ کو ”قافیہ“ کہتے ہیں جبکہ قافیے کے بعد بار بار جوں کے توں دہرائے جانے والے الفاظ ”ردیف“ کہلاتے ہیں۔ اب آپ بتائیے۔
 - i- اس حمد میں ردیف کیا ہے؟
 ا۔ تو ہے
 ب۔ ہے
 ج۔ کہاں تو ہے
 د۔ راز داں تو ہے
 - ii- اس حمد میں ”قافیہ“ کیا ہے؟
 ا۔ جہاں، کہاں، باغباں
 ب۔ تو ہے
 ج۔ ہے
 د۔ بو تیری
- 3- حمد میں شامل مندرجہ ذیل الفاظ کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے۔
 خلوت۔ جلوت۔ نشان۔ میزباں۔ چمن۔ بو۔ جلوہ۔
- 4- اس ’حمد‘ کا خلاصہ زیادہ سے زیادہ دس جملوں میں تحریر کریں۔
- 5- اس حمد کا مرکزی خیال ایک یا دو جملوں میں تحریر کریں۔
- 6- کسی اور شاعر کی کوئی اچھی سی ’حمد‘ تلاش کر کے اپنی ڈائری میں لکھیں۔

نعت

تو مقصدِ تخلیق ہے، تو حاصلِ ایمان
جو تجھ سے گریزاں، وہ خدا سے ہے گریزاں
کردار کا یہ حال، صداقت ہی صداقت
اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآن
کیا نام ہے، شامل ہے جو تکبیر و اذان میں
اس نام کی عظمت کے ہیں قربان، دل و جاں
اشکوں سے ترے، دین کی کھیتی ہوئی سیراب
فاقوں نے ترے، دہر کو بخشا سروساماں
انسان کو شائستہ و خوددار بنایا
تہذیب و تمدن، ترے شرمندہ احساں
رحمت کا یہ عالم ہے، مروت کا یہ انداز
ماہر سا گنہگار ہے، وابستہ داماں!

مشق

سوال 1۔ نعت کے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے مندرجہ ذیل سوالات کے دیے ہوئے جوابات میں سے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i۔ جس نظم میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعریف کی جائے اسے کیا کہتے ہیں؟

ا۔ حمد ب۔ نعت ج۔ منقبت د۔ قصیدہ

ii۔ اس نعت کے شاعر کا نام کیا ہے؟

ا۔ علامہ اقبال ب۔ مولانا حالی ج۔ ماہر القادری د۔ عبدالعزیز خاں

iii۔ اس نعت میں ردیف کیا ہے؟

ا۔ ایمان ب۔ احساں ج۔ داماں د۔ ردیف موجود نہیں

iv- مندرجہ ذیل میں سے کون سا لفظ نعت کا قافیہ ہے؟

ا۔ گریزاں ب۔ فاقوں ج۔ اذال د۔ اشکوں

سوال 2- مندرجہ ذیل شعر کی تشریح کریں۔

کردار کا یہ حال، صداقت ہی صداقت

اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآن

سوال 3- مندرجہ ذیل شعر کا مرکزی خیال لکھیں۔

انسان کو شائستہ و خوددار بنایا

تہذیب و حمدن، ترے شرمندہ احساں

سوال 4- اس نعت میں استعمال ہونے والے قافیوں کی نشاندہی کریں۔

سوال 5- مندرجہ ذیل الفاظ کا مفہوم لکھیں:

حاصل، گریزاں، صداقت، عظمت، سیراب۔

سوال 6- اس نعت میں سے اپنی پسند کے دو شعر لکھیں اور اپنی پسند کی وجہ بھی بیان کریں۔

سوال 7- کسی اور شاعر کی کوئی نعت اپنی ڈائری میں لکھیں اور اس کے قافیوں کی نشان دہی کریں۔

تسلیم و رضا

جو فقر میں پورے ہیں، وہ ہر حال میں خوش ہیں
گر مال دیا یار نے تو مال میں خوش ہیں
ہر کام میں، ہر دام میں، ہر حال میں خوش ہیں
بے زر جو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں
افلاس میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
گر یار کی مرضی ہوئی، سر جوڑ کے بیٹھے
موڑا انھیں جیدھر، وہیں منہ موڑ کے بیٹھے
اور شال اڑھائی تو اسی شال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
گر اُس نے دیا غم تو اسی غم میں رہے خوش
کھانے کو ملا کم تو اسی کم میں رہے خوش
دکھ درد میں، آفات میں، جنجال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
جینے کا نہ اندوہ، نہ مرنے کا ذرا غم
واقف نہ برس سے، نہ مہینے سے وہ اک دم
دن رات، گھڑی پہر، مہ و سال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں
اُن کے تو جہاں میں، عجب عالم ہیں نظیر، آہ
کیا جانے، فرشتے ہیں کہ آدم ہیں نظیر، آہ
جس ڈھال میں رکھا، وہ اُسی ڈھال میں خوش ہیں
پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں

مشق

1- نظم ”تسلیم و رضا“ کے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- اس نظم میں ”مرد“ سے کیا مراد لی گئی ہے؟

ا۔ بچے ب۔ بوڑھے ج۔ خواتین د۔ تمام انسان

ii- ”پورے ہیں وہی مرد جو ہر حال میں خوش ہیں“ مصرع نظم ”تسلیم و رضا“ کے

ا۔ ہر بند کا آخری مصرع ہے۔ ب۔ دوسرے اور تیسرے بند کا آخری مصرع ہے۔

ج۔ آخری بند کا آخری مصرع ہے۔ د۔ صرف پہلے بند کا آخری مصرع ہے۔

iii- ’جو فقر میں پورے ہیں وہ ہر حال میں خوش ہیں‘ کا دوسرا مصرع کیا ہے؟

ا۔ اخلاص میں، ادبار میں، اقبال میں خوش ہیں ب۔ بے زرجو کیا تو اسی احوال میں خوش ہیں

ج۔ دکھ درد میں، آفات میں، جنجال میں خوش ہیں د۔ ہر کام میں، ہر دام میں، ہر حال میں خوش ہیں

2- نظم ”تسلیم و رضا“ کا مرکزی خیال تحریر کریں جو تین سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

3- نظم ”تسلیم و رضا“ کے تیسرے بند کی تشریح کریں۔

4- نظم ”تسلیم و رضا“ کے ہم آواز الفاظ کے پانچ پانچ جوڑے لکھیں جیسے:

حال، مال

5- نظم ”تسلیم و رضا“ کا خلاصہ لکھیں جو دس جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

6- نظیر اکبر آبادی کی کوئی اخلاقی نظم پڑھیں اور اُس کے پسندیدہ اشعار اپنی ڈائری میں لکھیں۔

7- اپنے تعلیمی ادارے کے میگزین کے لیے نظیر اکبر آبادی کے چند اشعار منتخب کریں۔

میدانِ کر بلا میں صبح کا منظر

ٹھنڈی ہوا میں ، سبزہ صحرا کی وہ لہک
 شرمائے جس سے ، اطلس زنگاری فلک
 وہ جھومنا درختوں کا ، پھولوں کی وہ مہک
 ہر برگ گل پہ ، قطرہ شبنم کی وہ جھلک
 ہیرے نخل تھے ، گوہر یکتا نثار تھے
 چتے بھی ہر شجر کے ، جواہر نگار تھے
 وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
 دراج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
 وہ جوش گل ، وہ نالہ مرغانِ خوش نوا
 سردی جگر کو بخشی تھی ، صبح کی ہوا
 پھولوں سے سبز سبز شجر ، سرخ پوش تھے
 تھالے بھی نخل کے ، سید گل فروش تھے
 وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے ، وہ سبزہ زار
 پھولوں پہ جا بجا ، وہ گہربائے آبِ دلدار
 اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا ، بار بار
 بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ، ہزار
 خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
 شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ، ہجوم
 کو کو کا شور ، نالہ حق سڑہ کی دھوم
 سہجان ربنا کی صدا تھی ، علی العموم
 جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
 کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ، رب علی کی مدح
 ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی ، خدا کی مدح
 چیونٹی بھی ہاتھ اٹھا کے ، یہ کہتی تھی ، بار بار
 اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ، ترے نثار
 یا حی یا قدير کی تھی ہر طرف ، پکار
 تسبیح تھی کہیں ، کہیں جہلیل کردگار
 طائر ہوا میں مست ، ہرن سبزہ زار میں
 جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار میں

مشق

- 1- ”میدانِ کر بلا میں صبح کا منظر“ پیش نظر رکھتے ہوئے نیچے دیے گئے ہر درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔
 - i- برگِ گل پر کس کی جھلک تھی؟
 - ا- آفتاب کی کرن کی
 - ب- قطرہٴ شبنم کی
 - ج- مہتاب کی کرن کی
 - د- انجم کی کرن کی
 - ii- صبح کی ہوا کسے سردی بخشی تھی؟
 - ا- روح کو
 - ب- جان کو
 - ج- دل کو
 - د- جگر کو
 - iii- ”اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار“ کس کی زبان پر تھا؟
 - ا- چیونٹی کی
 - ب- ہرن کی
 - ج- شیر کی
 - د- قمری کی
- 2- نظم ”میدانِ کر بلا میں صبح کا منظر“ کا مرکزی خیال تحریر کریں جو تین جملوں سے زائد نہ ہو۔
- 3- مختصر جواب لکھیں جو تین سطروں سے زائد نہ ہوں۔
 - i- پہلے بند کے پہلے دونوں اشعار کے قوافی کی نشان دہی کریں۔
 - ii- نظم کا کوئی ایسا شعر لکھیں جس میں ردیف موجود ہے۔
 - iii- اس نظم میں کن کن جانوروں اور پرندوں کے نام آئے ہیں؟
- 4- نظم ”میدانِ کر بلا میں صبح کا منظر“ کے آخری بند کی تشریح کریں۔
- 5- نظم ”میدانِ کر بلا میں صبح کا منظر“ کا خلاصہ لکھیں جو زیادہ سے زیادہ دس جملوں پر محیط ہو۔
- 6- ان تراکیب کا مطلب لکھیں۔

سبزہٴ صحرا، جوشِ گل، نالہٴ مرغانِ خوش نوا، برگِ گل، نالہٴ حقِ سرُّہ۔

مستقبل کی جھلک

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہوگی اک دنیا نئی
خونِ مسلم صرف تعمیرِ جہاں ہو جائے گا
بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہو جائے گا ، باطل نہاں ہو جائے گا
ان کو اکب کے عوض ، ہوں گے نئے انجمِ طلوع
ان دنوں رخشندہ تر ، یہ آسماں ہو جائے گا
پھر نئے محمود ہوں گے حامیِ دینِ متین
بچہ بچہ ، غیرتِ الپ ارسلان ہو جائے گا
میرے جیسے ہوں گے پیدا ، سیکڑوں اہلِ سخن
نکتہ نکتہ جن کا ، آزادی کی جاں ہو جائے گا
ڈھائی جائے گی پنا ، یورپ کے استعمار کی
ایشیا ، آپ اپنے حق کا پاسباں ہو جائے گا
نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دیر میں
وہ جو دارالحرب ہے ، دارالاماں ہو جائے گا
ہم کو سودا ہے غلامی کا ، کہ آزادی کی دھن
چند ہی دن میں ، ہمارا امتحاں ہو جائے گا
اس بشارت کو نہ سمجھو ، ایک دل خوش کن قیاس
جس کو سن کر ہر مسلمان شادماں ہو جائے گا
سچ ہے میرا حرف اور جس کو اس میں شک ہے آج
دیکھ لینا کل مرا ، ہم داستاں ہو جائے گا

مشق

1- نظم کا متن پیش نظر رکھتے ہوئے درج ذیل سوالات کے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- 'ہو جائے گا' اس نظم میں کیا ہے؟

ا۔ تشبیہ ب۔ استعارہ ج۔ قافیہ د۔ ردیف

ii- کواکب کے عوض کیا طلوع ہوں گے؟

ا۔ نئے خورشید ب۔ نئے ماہتاب ج۔ نئے انجم د۔ نئے اجرام

iii- کن کا نکتہ کلیتہً آزادی کی جاں ہوگا؟

ا۔ اہل قلم کا ب۔ اہل سخن کا ج۔ اہل وفا کا د۔ اہل ہنر کا

iv- دین میں کے حامی کون ہوں گے؟

ا۔ نئے محمود ب۔ نئے ایاز ج۔ نئے طارق د۔ نئے ایوبی

2- رخشندہ تر، محمود، دین میں۔ یورپی استعمار۔ خوش کن قیاس کے مفہوم کی وضاحت کریں۔

3- تبلیغ کی تعریف لکھیں اور اس نظم کے اُس شعر کی تشریح کریں جس میں تبلیغ استعمال ہوئی ہے۔

4- نظم "مستقبل کی جھلک" کا خلاصہ تحریر کریں جو دس جملوں سے زیادہ نہ ہو۔

5- نظم "مستقبل کی جھلک" کا مرکزی خیال ایک دو جملوں میں تحریر کریں۔

6- نظم "مستقبل کی جھلک" کے پہلے اور آٹھویں شعر کی تشریح کریں۔

7- مولانا ظفر علی خاں کی ملی حوالے سے لکھی گئی کوئی اور نظم ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹوریل گروپ میں سنائیں۔

برسات

گھٹاؤں کی نیلی فام پریاں، اُفق پہ دھوئیں مچا رہی ہیں
 ہواؤں میں تھر تھرا رہی ہیں، فضاؤں کو گد گدا رہی ہیں
 پُچن شُکفتہ، دَمَن شُکفتہ، گلاب خنداں، سَمَن شُکفتہ
 ہنستا و نسترن شُکفتہ ہیں، پتیاں مُسکرا رہی ہیں
 یہ مینہ کے قطرے چل رہے ہیں، کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں
 اُفق سے موتی اُبل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں
 نہیں ہے کچھ فرق بحر و بر میں، کھنچا ہے نقشہ یہی نظر میں
 کہ ساری دنیا ہے اک سمندر، بہاریں جس میں نہا رہی ہیں
 چمن ہے رنگیں، بہار رنگیں، مناظر سبزہ زار رنگیں
 ہیں وادی و کوہسار رنگیں، کہ بجلیاں رنگ لا رہی ہیں
 پُچن میں اختر بہار آئی، لہک کے صوت ہزار آئی
 صبا گلوں میں پُکار آئی، اُٹھو گھٹائیں پھر آ رہی ہیں

مشق

1- ”برسات“ کے متن کو پیش نظر رکھ کر ہر درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- ”نیلی فام“ سے کیا مراد ہے؟

ب۔ نیلے رنگ کی

ا۔ سُرخ رنگ کی

د۔ سیاہ رنگ کی

ج۔ سفید رنگ کی

ii- ”اُفق“ کسے کہتے ہیں؟

ب۔ آسمان کو

ا۔ اس جگہ کو جہاں زمین اور آسمان ملتے ہیں

د۔ فضا کو

ج۔ آسمان پر پھیلنے والی سُرخنی کو

iii- بقول شاعر ساری دنیا کیا ہے؟

۱۔ ایک چمن ب۔ ایک دریا ج۔ ایک سمندر د۔ ایک ننھا سیارہ

2- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی تشریح کریں۔

بحر و بر۔ مناظر بہزہ زار۔ وادی کو ہزار۔ نیلی فام۔ چمن۔

3- اس نظم میں ”ردیف“ کی نشان دہی کریں۔

4- ان اشعار کی تشریح کریں۔

گھٹاؤں کی نیلی فام پریاں، افق پہ دھو میں مچا رہی ہیں

ہواؤں میں تھر تھرا رہی ہیں، فضاؤں کو جگمگا رہی ہیں

چمن شگفتہ، دمن شگفتہ، گلاب خنداں، سمن شگفتہ

بنفشہ و نسترن شگفتہ ہیں، پتیاں مسکرا رہی ہیں

5- جب کسی لفظ کو اُس کے اصل معنی کی بجائے مجازی معنی میں اس طرح استعمال کیا جائے کہ اصل اور مجازی معنی میں تشبیہ کا تعلق ہو تو

اُسے استعارہ کہتے ہیں۔ اس شعر میں استعارے کی نشان دہی کریں۔

یہ مینہ کے قطرے پھل رہے ہیں کہ ننھے سیارے ڈھل رہے ہیں

افق سے موتی اُبل رہے ہیں، گھٹائیں موتی لٹا رہی ہیں

6- نظم ”برسات“ کا خلاصہ لکھیے جو زیادہ سے زیادہ دس جملوں پر محیط ہو۔

7- باغ کی سیر کا آنکھوں دیکھا حال لکھیں۔

ہلالِ استقلال

یہ استقلال کا پرچم ہے ، استحکام کا پرچم
 شہیدوں غازیوں کے ہاتھ سے ، انعام کا پرچم
 ہلالی خنجر، انگشتِ شہادت کا اشارہ ہے
 یہ سیف اللہ کا پرتو ، فلک پر آشکارا ہے
 ہلالِ خنجر قوی عطیہ ہے شہیدوں کا
 جو خود قربان ہو کر ، بھر گئے دامنِ نویدوں کا
 حسینؑ ابنِ علیؑ کے اسوۂ مردانہ کا پرچم
 برائے شمعِ ملت ، سوزشِ پروانہ کا پرچم
 محمد ابنِ قاسمؑ کے سحابِ جود کا پرچم
 یہ طارقؑ کا ، صلاح الدینؑ کا ، محمودؑ کا پرچم
 یہ پرچم ہے نشان ، عالم میں فتح و کامرانی کا
 زمیں پر ابرِ رحمت ہے ، نویدِ آسمانی کا
 یہ پرچم ہے روایاتِ عظیم الشان کا پرچم
 یہی پرچم ہے استقلالِ پاکستان کا پرچم

مشق

1- نظم ”ہلالِ استقلال“ کے متن کو مد نظر رکھتے ہوئے ہر سوال کے درست جواب کے شروع میں ”✓“ کا نشان لگائیں۔

i- شاعر نے ”زمین پر ابرِ رحمت“ کہا ہے؟

ا۔ ہلالی پرچم کو

ب۔ مال و دولتِ دنیا کو

ج۔ اشاعتِ اسلام کو

د۔ خوش حالی کو

-ii ”سیف اللہ“ سے شخصیت مراد ہیں:

ا۔ طارق بن زیاد

ب۔ محمود غزنوی

ج۔ خالد بن ولید

د۔ صلاح الدین ایوبی

-iii ”ہلال خجرقوی“ کن کا عطیہ ہے؟

ا۔ مجاہدوں کا

ب۔ شہیدوں کا

ج۔ سیاست دانوں کا

د۔ فوجی جرنیلوں کا

2- اس نظم کے اشعار میں شامل تعلیمات کی الگ الگ وضاحت کریں۔

3- مندرجہ ذیل تراکیب کی وضاحت کریں۔

اکلشت شہادت، ہلال خجرقوی، شمع ملت، سحاب جود، فتح و کامرانی، ابر رحمت، نوید آسانی، اسوۂ مردانہ۔

4- اس نظم کا خلاصہ لکھیں جو دس سطور سے زیادہ نہ ہو۔

5- اس نظم میں سے اپنے تین پسندیدہ اشعار منتخب کریں، انہیں اپنی ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹوریل گروپ میں پڑھ کر سنائیں۔

خطاب بہ جوانان اسلام

وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟
کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں، تاج سردارا
وہ صحرائے عرب، یعنی شتربانوں کا گہوارا
”باب ورنگ و خال و خط، چہ حاجت روئے زیبا را“^۱
کہ منعم کو گدا کے ڈر سے، بخشش کا نہ تھا یارا
مگر تیرے تخیل سے فزوں تر ہے، وہ نظارا
کہ تو گشتار، وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا
ٹھٹھا سے زمیں پر آسمان نے ہم کو دے مارا
نہیں دنیا کے آئین مسلم سے کوئی چارا
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سپارا

کبھی اے نوجوان مسلم! بند بڑ بھی کیا تو نے؟
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں
تمدنِ آفریں، خلاقِ آئین جہاں داری
سماںِ الفخرِ خُریٰ^۲ کا، رہا شانِ امارت میں
گدائی میں بھی وہ اللہ والے تھے غیور اتنے
اگر چاہوں تو نقشہ کھینچ کر الفاظ میں رکھ دوں
تجھے آبا سے اپنے، کوئی نسبت ہو نہیں سکتی
گنوا دی ہم نے، جو اسلاف سے میراث پائی تھی
حکومت کا تو کیا رونا، کہ وہ اک عارضی شے تھی
مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی

”غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعان را تماشا گن
کہ نورِ دیدہ اش روشن کند چشمِ زلیخا را“^۳

^۱ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امارت کی بجائے فقر پر فخر محسوس کیا۔ ”الفخرِ خُریٰ“ آپ ہی کے الفاظ مبارک ہیں۔

^۲ خوب صورت چہرے کو ظاہری زیبائش کی حاجت نہیں ہوتی۔ (حافظ شیرازی کا مصرع ہے)

^۳ اے غنی پیرِ کنعان کی بد نصیبی تو دیکھ کہ ان کی آنکھوں کا نور زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر رہا ہے (یہ شعر غنی کا شعری کا ہے)۔

پیغام ۱

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں! ذرا
 دانہ ٹو، کھیتی بھی ٹو، ہاراں بھی ٹو، حاصل بھی ٹو
 آہ! کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے
 راہ ٹو، رہرو بھی ٹو، رہبر بھی ٹو، منزل بھی ٹو
 کانپتا ہے دل ترا، اندیشہ طوفاں سے کیا
 ناخدا ٹو، بحر ٹو، کشتی بھی ٹو، ساحل بھی ٹو
 دیکھ آکر کوچہ چاک گریباں میں کبھی!
 قیس ٹو، لیلیٰ بھی ٹو، صحرا بھی ٹو، محل بھی ٹو
 وائے نادانی! کہ تو محتاج ساقی ہو گیا
 مے بھی ٹو، مینا بھی ٹو، ساقی بھی ٹو، محفل بھی ٹو
 شعلہ بن کر پھونک دے خاشاک غیر اللہ کو
 خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی ٹو
 بے خبر! ٹو جوہر آئینہ لیام ہے
 ٹو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

مشق

- 1- علامہ محمد اقبالؒ کی نظموں کے متن کو مد نظر رکھتے ہوئے درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں:
 - i- علامہ محمد اقبالؒ نے ”خطاب بہ جوانان اسلام“ کے پہلے شعر میں مسلم نوجوان سے کیا کہا ہے؟
 - ا۔ تدر بھی کیا تو نے؟
 - ب۔ تصور بھی کیا تو نے؟
 - ج۔ ارادہ بھی کیا تو نے؟
 - د۔ تحیر بھی کیا تو نے؟
 - ii- مسلم نوجوان کو کس قوم نے آغوشِ محبت میں پالا ہے؟
 - ا۔ جس نے شہنشاہِ روم کو شکست دی
 - ب۔ جس نے قیصر و کسریٰ پر فتح پائی
 - ج۔ جس نے آدھی دنیا پر حکومت کی
 - د۔ جس نے تاج سردارِ اپتل ڈالا
- ۱۔ یہ اشعار نظم ”شیعہ اور شاعر“ سے لیے گئے ہیں۔

iii- ”منعم“ کے لغوی معنی ہیں۔

ا۔ دولت مند سخی

ب۔ انعام و اکرام

ج۔ انعام پانے والا

د۔ سخی بادشاہ

2- ”خطاب بہ جوانان اسلام“ میں آنے والی تلمیحات کی مختصر تشریح کریں جو تین تین سطروں سے زیادہ نہ ہو۔

3- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

الف۔

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی نہیں دُنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی جو دیکھیں اُن کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا

ب۔

”شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو خوفِ باطل کیا کہ ہے غارتِ گر باطل بھی تو“

4- ”خطاب بہ جوانان اسلام“ اور ”پیغام“ کا مرکزی خیال لکھیں۔

5- ”خطاب بہ جوانان اسلام“ اور ”پیغام“ کا خلاصہ لکھیں۔

6- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

تدبّر، تاجِ سردار، منعم، حکومتِ کارونا، اندیشہِ طوفان، آئینِ مسلم، سیپارہ۔

ایسٹریکٹ آرٹ

ایسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
 کی تھی ازراہ مرثیہ بھی ستائش میں نے
 آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
 لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا تو شرماتا ہوں
 ایک تصویر کو دیکھا جو کمال فن تھی
 بھینس کے جسم پر اک اونٹ کی سی گردن تھی
 ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں
 ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
 ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
 ورق صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے
 آڑی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ لگن
 جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن
 اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
 ڈر کے ماؤں کے کلیجے سے لپٹ جاتے تھے
 الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
 آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف
 میں نے یہ کام کیا ، سخت سزا پانے کا
 یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

مشق

1- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- شاعر نے تصاویر کی تعریف کیوں کی؟

ا۔ ان سے متاثر ہو کر ب۔ فن کی باریکی کو سمجھ کر

ج۔ ان کی خوب صورتی کی وجہ سے د۔ محض مروت سے

ii- شاعر نے تصویر میں بھینس کے جسم پر کس جانور کی گردن دکھائی ہے؟

ا۔ گائے کی ب۔ اونٹ کی

ج۔ بکری کی د۔ ہاتھی کی

iii- شاعر کے خیال میں نمائش حقیقت میں کیا تھی؟

ا۔ ایک یادگار نمائش ب۔ دیوانے کا خواب

ج۔ آرٹ کی خدمت د۔ تصاویر کا قابل قدر نمونہ

2- مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں استعمال کریں:

ستائش، مصوّر، اطفال، جائزہ، نمائش۔

3- نظم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں لکھیں۔

4- مختصر جواب دیں:

i- شاعر نے کس قسم کے آرٹ کی نمائش دیکھی؟

ii- کیا شاعر اس نمائش سے متاثر ہوا؟

iii- شاعر نے اس نمائش کی تعریف کیوں کی؟

iv- نمائش کی تصویروں کا بچوں پر کیا اثر ہوا؟

v- شاعر اس نمائش کو کیا قرار دیتا ہے؟

5- نظم کے آخری دو اشعار کی تشریح کریں۔

6- سید محمد جعفری کی کوئی اور مزاحیہ نظم اپنی ڈائری میں لکھیں۔

قطعات

شاعر

کل ایک مَقَرِّ مجھے کہتا تھا سرِ راہ
شاید تری مِلّت کا ہے مٹنے کا ارادہ
میں نے یہ کہا اُس سے کوئی وجہ بھی ہو گی
بولا کہ تری قوم میں شاعر ہیں زیادہ

اخباری اشتہار

نوکری کے لیے اخبار کے اعلان نہ پڑھ
جان پہچان کی باتیں ہیں، کہا مان، نہ پڑھ
جن کو ملنی ہو، انھیں پہلے ہی مل جاتی ہے
بس دکھاوے ہی کے ہوتے ہیں یہ فرمان نہ پڑھ

غفلت

اے ساتی گلِ فام بُرا ہو ترا تُو نے
باتوں میں لبھا کر ہمیں وہ جامِ پلایا
یہ حال ہے سو سال غلامی میں بسر کی
اور ہوش ہمیں اب بھی مکمل نہیں آیا

ریڈیو

جن کو انگریز کا قانون ہو اُزبر اُن سے
اور سب پوچھ مگر شرع کے احکام نہ پوچھ
ریڈیو میں بھی جو قرآن کی تلاوت نہ سنیں
اُن مسلمانوں کی اولاد کا اسلام نہ پوچھ

مشق

1- محمود سرحدی کے قطعات مد نظر رکھ کر مندرجہ ذیل سوالات کے مختصر جواب تحریر کریں:

i- شاعر نے ملت کے مٹنے کی کیا وجہ بیان کی ہے؟

ii- ”ساقی گل فام“ سے کیا مراد لی گئی ہے؟

iii- قطعہ ”غفلت“ میں ہماری کس خاص حالت کا ذکر کیا گیا ہے؟

iv- قطعہ ریڈیو، اور اخباری اشتہار کا مرکزی خیال لکھیے۔

v- آپ کو کون سا قطعہ پسند آیا اور کیوں؟

نوٹ: قطع عربی کا لفظ ہے، جس کا مطلب کاٹنا یا ٹکڑے کرنا ہے۔ لفظ ”قطعہ“ اسی سے بنا ہے جس کا مطلب کاٹنا ہوا کوئی حصہ یا ٹکڑا ہے۔

اصناف سخن کی اصطلاح میں قطعے سے مراد کم از کم دو شعروں کا وہ حصہ ہے جو قصیدے اور غزل کی طرح ہم قافیہ یا ہم قافیہ وردیف

ہو اور اس کے ساتھ ساتھ مضمون میں معنوی ربط یا تسلسل ضروری ہے۔

کسی اور مزاحیہ وطنیہ قطعے کو اپنی ڈائری میں لکھیں اور ٹیوٹر ریل گروپ میں پڑھ کر سنائیں۔

لوکل بس

بس میں لنک رہا تھا کوئی ، ہار کی طرح
 کوئی پڑا تھا ، سایہ دیوار کی طرح
 سہا ہوا تھا کوئی ، گنہگار کی طرح
 کوئی پھنسا تھا ، مرغ گرفتار کی طرح

محروم ہو گیا تھا کوئی ، ایک پاؤں سے
 جوتا بدل گیا تھا کسی کا ، کھڑاؤں سے

گاڑی میں ایک شور تھا ، کنڈکٹر آگے چل
 کہہ دے خدا کے واسطے ، ہاں ٹھیک ہے ڈبل
 کب تک کھڑا رہے گا سرچارہ عمل
 لڑنے کی آرزو ہے تو باہر ذرا نکل

تجھ پہ خدا کی مار ہو ، اشارت کر دے بس
 دو پیسے اور لے لے جو دولت کی ہے ہوس

کنڈکٹر اب یہ کہتا تھا ، وہ بس چلائے کیوں
 جو بس میں آ گیا ہے ، کرے ہائے ہائے کیوں
 جس کو ہو جاں عزیز ، مری بس میں آئے کیوں
 ایسے ہی گل بدن تھے تو پیسے بچائے کیوں

ٹھانی ہے دل میں ، اب نہ دیں گے کسی سے ہم
 تنگ آ گئے ہیں ، روز کی کنڈکٹری سے ہم

مشق

- 1- نظم ”لوکل بس“ کے متن کو پیش نظر رکھ کر ہر درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔
 - i- بس میں کوئی لنک رہا تھا۔
 - ا۔ ہار کی طرح
 - ب۔ گرفتاری طرح
 - ج۔ بیمار کی طرح
 - د۔ گتھگاری طرح
 - ii- لوگ کنڈکٹر کو کتنے پیسے اور دینے کو تیار تھے؟
 - ا۔ دو
 - ب۔ پانچ
 - ج۔ دس
 - د۔ بیس
 - iii- کنڈکٹر کس سے تنگ آ گیا تھا؟
 - ا۔ مسافروں سے
 - ب۔ بس کی حالت سے
 - ج۔ تنگ دستی سے
 - د۔ کنڈکٹری سے
- 2- اس نظم کے دوسرے اور تیسرے بند میں کنڈکٹر اور مسافر کے درمیان ہونے والی کھینچا تانی کو مکالمے کے انداز میں لکھیں۔
- 3- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مطلب لکھیں۔

سایہ دیوار، مرغ گرفتار، سرچارہ عمل، گل بدن، کھڑاؤں۔
- 4- نظم ”لوکل بس“ کا خلاصہ لکھیں۔
- 5- ”بس میں سفر“ کی روداد ڈائری میں لکھیں۔
- 6- کسی اور شاعر کی ایک مزاحیہ نظم اپنی ڈائری میں لکھیں اور یوٹو ریل گروپ میں پڑھیں۔

وحدانیت

ہے یہ شاہی فقط تجھے زیبا
تیری سطوت کا ہی رہے چرچا
کوئی مشفق نہیں ترے جیسا
میرا مقصد ہے بس ترا جلو
دید سے اپنی بہرہ ور فرما
میرا پیکر گنہ میں ہے ڈوبا
تیری رحمت کا پھر بھی ہے سودا

(ترجمہ۔ طارق قریشی)

اے خدا، تو ہے واحد و یکتا
تو اگر قہر پر اُتر آئے
اور اگر رحمتوں پہ مائل ہو
قہر و رحمت پہ قادر، اے ستار
جب قیامت کی آئے گی ساعت
مثل مجنوں کے ہوں جنوں ساماں
باوجودیکہ پر ہوں عصیاں سے

مشق

- 1- نظم ”وحدانیت“ کے متن کو پیش نظر رکھتے ہوئے، درج ذیل سوالات کے درست جواب پر (✓) کا نشان لگائیں۔
 1- پہلے شعر میں اللہ تعالیٰ کی کس صفت کا ذکر ہے؟
 ا۔ وحدت و یکتائی ب۔ سطوت ج۔ رحمت د۔ شفقت
- ii- چوتھے شعر میں شاعر نے اپنے کون سے دلی مقصد کا اظہار کیا ہے؟
 ا۔ اپنی مغفرت کا حصول ب۔ اللہ کی رحمت کا حصول
 ج۔ اللہ کے جلوے کا حصول د۔ توبہ کی توفیق کا حصول
- iii- شاعر نے اپنے پیکر کے بارے میں کیا کہا ہے؟
 ا۔ گنہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ ب۔ بہت کمزور ہے
 ج۔ جنوں ساماں اور لاغر ہے۔ د۔ تمام قوی مضبوط ہیں
- 2- اس نظم کے تمام توانی الگ الگ کر کے لکھیں۔
- 3- اس نظم کے اس شعر کی تشریح کریں جس میں تلمیح استعمال کی گئی ہو۔
- 4- اس نظم کا مرکزی خیال تحریر کریں جو تین سطروں سے زیادہ نہ ہو۔
- 5- شاعر کو گنہگار ہونے کے باوجود کس بات کا سودا ہے؟
- 6- نظم ”وحدانیت“ کا خلاصہ لکھیں۔
- 7- ”وحدانیت“ کس شاعر کے کلام کا ترجمہ ہے۔

حصہ غزل

(1)

جس سر کو غرور آج ہے ، یاں تاج وری کا
آفاق کی منزل سے گیا ، کون سلامت
ہر زخم جگر داورِ محشر سے ہمارا
لے سانس بھی آہستہ ، کہ نازک ہے بہت کام
کل ، اس پہ یہیں شور ہے ، پھر نوحہ گری کا
اسباب لٹا راہ میں ، یاں ہر سفری کا
انصاف طلب ہے ، تری بیدادگری کا
آفاق کی اس کارِ عمر شیشہ گری کا
ٹک میر جگر سوختہ کی ، جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے ، چراغِ سحری کا

(2)

گل کو ہوتا صبا ! قرار اے کاش!
یہ جو دو ~~آنکھیں~~ ، مند گئیں میری
کن نے اپنی مصیبتیں نہ گئیں
جان آخر تو جانے والی تھی
اس میں راہِ سخن نکلتی تھی
رہتی اک آدھ دن ، بہار اے کاش!
اس پہ وا ہوتیں ، ایک بار اے کاش!
رکھتے میرے بھی غم ، شمار اے کاش!
اس پہ کی ہوتی ، میں شمار اے کاش!
شعر ہوتا ترا شعار ، اے کاش!

شش جہت اب تو تنگ ہے ہم پر

اس سے ہوتے نہ ہم ، دو چار اے کاش!

مشق

1- شامل نصاب میر کی پہلی غزل میں تاج وری، نوحدہ گری، سفری، بیداد گری، شیشہ گری اور چراغ سحری ہم آواز الفاظ ہیں۔ شعری اصطلاح میں ایسے ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہتے ہیں۔ اسی غزل کے ہر شعر میں قافیہ کے بعد ”کا“ بغیر کسی رد و بدل کے استعمال ہوا ہے۔ ایسے لفظ یا الفاظ کو شعری اصطلاح میں ردیف کہتے ہیں۔ قافیہ کا لغوی مفہوم ہے پے در پے آنے والا، پیچھے پیچھے آنے والا۔ اصطلاحی مفہوم میں قافیہ ان ہم آواز الفاظ کو کہتے ہیں جو غزل یا قصیدے کے مطلع کے دونوں مصرعوں میں اور باقی تمام اشعار کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر پر اور ردیف سے پہلے آتے ہیں۔ جیسے دونوں غزلوں میں تاج وری، سفری، قرار، بہار وغیرہ۔

ردیف کا لغوی مفہوم ہے گھڑ سوار کے پیچھے بیٹھنے والا۔ اصطلاحی معنی میں اس سے مراد وہ لفظ یا الفاظ ہیں جو غزل یا قصیدے کے پہلے شعر کے دونوں مصرعوں میں اور باقی تمام اشعار کے ہر دوسرے مصرعے کے آخر پر قافیہ کے بعد ہو بہود ہر اے جاتے ہیں۔ جیسے پہلی غزل میں ”کا“۔

آپ میر کی دوسری غزل کے قوافی اور ردیف کی نشان دہی کریں۔

2- غزل کا پہلا شعر، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوں، مطلع کہلاتا ہے۔ میر کی دونوں غزلوں کے مطلع لکھیں اور ان کی تشریح کریں۔

3- مندرجہ ذیل سوالات کے جوابات میں سے درست جواب پر نشان ”✓“ لگائیں۔

i- ”جس سر کو غرور آج ہے یاں تا جوری کا“..... کس شاعر کی غزل کا مصرع ہے؟
 ا- علامہ اقبال کی ب- مولانا حالی کی ج- آتش د- میر تقی میر کی
 ii- گل کو ہوتا صبا قرارے کا ش! رہتی ایک آدھ دن بہار اے کا ش!

یہ شعر غزل میں کیا ہے۔

ا- مطلع ب- مقطع ج- قافیہ د- ردیف

iii- ٹنگ میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے کیا یا رہرو سا ہے چراغ سحری کا

یہ شعر غزل میں کیا ہے؟

ا- مطلع ب- مقطع ج- قافیہ د- ردیف

iv- میر تقی میر کی وجہ شہرت کیا ہے؟

ا- نظم گوئی ب- مثنوی نگاری ج- غزل گوئی د- مزاحیہ شاعری

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کے معنی لکھیں۔

تاج وری، بیداد گری، چراغ سحری، شش بہت، قرار۔

5- میر تقی میر کی کوئی اور غزل لکھیں اور اس میں سے مطلع اور مقطع الگ کر کے لکھیں۔

اس غزل کے قافیہ اور ردیف بھی ترتیب وار لکھیں۔

(1)

ہوائے دورِ مئے خوش گوار ، راہ میں ہے
عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ، ہستی میں
نہ کوئی شہر، نہ کوئی دیار ، راہ میں ہے
نہ بدرقہ ہے ، نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار ، راہ میں ہے
سفر ہے شرط، مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا فخر سایہ دار ، راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے ، پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے ، دشمن ہزار ، راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گل مراد ہے منزل میں ، خار راہ میں ہے

(2)

یہ آرزو تھی ، تجھے گل کے روبرو کرتے
پیام بر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا
ہم اور بلبل بے تاب ، گفتگو کرتے
مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی، یہ بھی ہیں جستجو کرتے
ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے ، رفو کرتے

نہ پوچھ ، عالم برگشتہ طالع ، آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مشق

- 1- پہلی غزل میں ”راہ میں ہے“ ردیف ہے۔ آتش کی دوسری غزل میں ”ردیف“ کی نشان دہی کریں۔
- 2- شامل نصاب آتش کی غزلوں کو پیش نظر رکھ کر نیچے دیے گئے ہر سوال کے درست جواب پر (✓) لگائیے۔
 - i- مسافرنواز کے کہا گیا ہے؟
 - ا۔ راہبر قافلہ کو
 - ب۔ شجر سایہ دار کو ج۔ سامان سفر کو د۔ منزل مقصود کو
 - ii- ”عدم کے کوچ“ سے کیا مراد ہے؟
 - ا۔ دوسری دنیا کا سفر
 - ب۔ زندگی کا سفر ج۔ عام سفر د۔ منجی سفر
 - iii- بدرقہ اور رفیق ساتھ نہ ہو تو کون کام آتا ہے؟
 - ا۔ اپنی ہمت
 - ب۔ اپنی ذات ج۔ سامان سفر د۔ عنایت پروردگار
- 3- مختصر جواب دیں۔
 - i- آتش کی وجہ شہرت کیا ہے؟
 - ii- آتش کی دوسری غزل کے قافیے ترتیب وار لکھیں۔
 - iii- دوسری غزل کے مقطع کو پیش نظر رکھ کر بتائیں کہ آتش اپنی قسمت کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔
 - iv- اس غزل کے مطلع میں آتش نے کیا آرزو کی ہے؟
- 4- آتش کی دوسری غزل کے دوسرے شعر کی تشریح کریں۔
- 5- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔
 - مسافرنواز، زبان غیر، ہوائے دور مئے خوش گوار، گل مراد، بدرقہ۔
- 6- آتش کی کوئی اور غزل لکھیں اور اس کا مطلع اور مقطع لکھنے کے بعد اس کے قافیے اور ردیف ترتیب وار لکھیں۔

(1)

پھرے راہ سے وہ ، یہاں آتے آتے
نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی
سنانے کے قابل جو تھی بات ان کو
مرے آشیاں کے تو تھے چار تنکے
اجل مر رہی تُو ، کہاں آتے آتے
بہت دیر کی ، مہرباں آتے آتے
وہی رہ گئی ، درمیاں آتے آتے
چن اڑ گیا ، آندھیاں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغ ! یاروں سے کہ دو
کہ آتی ہے اردو زباں ، آتے آتے

(2)

خاطر سے یا لحاظ سے ، میں مان تو گیا
دل لے کے مفت کہتے ہیں کچھ کام کا نہیں
ڈرتا ہوں دیکھ کر دل بے آرزو کو میں
افشائے رازِ عشق میں گو ذلتیں ہوں
گو نامہ بر سے خوش نہ ہوا پر ہزار شکر
بزمِ عدو میں صورتِ پروانہ دل مرا
جھوٹی قسم سے ، آپ کا ایمان تو گیا
الٹی شکایتیں ہوئیں احسان تو گیا
سُنسان گھر یہ کیوں نہ ہو ، مہمان تو گیا
لیکن اسے جتا تو دیا جان تو گیا
مجھ کو وہ میرے نام سے ، پہچان تو گیا
گو رشک سے جلا تیرے قربان تو گیا

ہوش و حواس و تاب و تواں ، داغ ! جا چکے
اب ہم بھی جانے والے ہیں ، سامان تو گیا

مشق

1- مرزا داغ کی غزلوں کو ذہن میں لائیں اور درج ذیل مصرعے درست لفظ/الفاظ سے مکمل کریں۔

i- پھرے راہ سے آتے آتے۔

ا۔ درمیاں ب۔ وہ یہاں ج۔ ہم عنان

ii- اب ہم بھی جانے والے ہیں تو گیا۔

ا۔ میزبان ب۔ مہمان ج۔ سامان

iii- سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو تو گیا۔

ا۔ انسان ب۔ سلطان ج۔ مہمان

2- ”اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا“ میں سامان کا مفہوم زیادہ سے زیادہ تین سطروں میں لکھیں۔

3- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

نہ جانا کہ دُنیا سے جاتا ہے کوئی

بہت دیر کی مہرباں آتے آتے

نہیں کھیل اے داغ یاروں سے کہ دو

کہ آتی ہے اردو زبان آتے آتے

ڈرتا ہوں دیکھ کر دلی بے آرزو کو میں

سنسان گھر یہ کیوں نہ ہو، مہمان تو گیا

4- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

دل بے آرزو، سنسان گھر، افشائے راز، نامہ بر، ہم عنان، اجل

5- دونوں غزلوں کے قوانی بالترتیب لکھیں۔

6- نصابی غزلوں کے علاوہ داغ کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں۔

(1)

اثر اس کو ، ذرا نہیں ہوتا
ذکر اغیار سے ہوا معلوم
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
حال دل یار کو لکھوں کیوں کر
چارہ دل ، سوائے صبر نہیں
رنج ، راحت فرا نہیں ہوتا
حرفِ ناصح بُرا نہیں ہوتا
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
ہاتھ دل سے جدا نہیں ہوتا
سو ، تمھارے سوا نہیں ہوتا

فالب

کیوں نے عرض مضطرب ، مومن
صنم آخر خدا نہیں ہوتا

(2)

ٹھانی تھی دل میں ، اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں ، کسی کو کسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم ، اسے کیا کہتے ہیں بھلا
بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبارِ دل
کیا گل کھلے گا ، دیکھیے ، ہے فصلِ گل تو دُور
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ رہتے ہیں ، کس بے کسی سے ہم
انصاف کیجیے پوچھتے ہیں ، آپ ہی سے ہم
شاید شکایتوں پہ تیری مدعی سے ہم
کہتے تھے ان کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم
اور سُوئے دشت بھاگتے ہیں ، کچھ ابھی سے ہم

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں ، جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

- 1 خالی جگہ پر کر کے مندرجہ ذیل اشعار مکمل کریں
- i چارۂ دل سوائے صبر نہیں ہوتا
سو تمہارے نہیں ہوتا
- ii اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا
..... راحت فزا نہیں ہوتا
- iii ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے جی سے ہم
- 2 مختصر جواب دیں۔
- i مومن کی پہلی غزل کی ردیف کیا ہے؟
- ii مومن کی دوسری غزل کے قوافی لکھیں۔
- iii مومن کی پہلی غزل کا مطلع لکھیں۔
- iv مومن کی دوسری غزل کا مقطع لکھیں۔
- 3 تشریح کیجیے۔
- i تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
- ii کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصل گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
- 4 مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم لکھیں۔
سوئے دشت۔ ناچار۔ ربط۔ راحت فزا۔ صنم۔
- 5 مومن کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں۔

(1)

بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
نہ چھیڑاے ہم نشیں! کیفیتِ صہبا کے افسانے
نہیں آتی تو یاد اُن کی، مہینوں تک نہیں آتی
الہی ترکِ اُلفت پر، وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
شرابِ بے خودی کے، مجھ کو ساغرِ یاد آتے ہیں
مگر جب یاد آتے ہیں، تو اکثر یاد آتے ہیں

حقیقت گھل گئی حسرت، ترے ترکِ محبت کی
تجھے تو اب وہ پہلے سے بھی، بڑھ کر یاد آتے ہیں

(2)

رسمِ جفا کامیاب، دیکھیے کب تک رہے
دل پہ رہا مدتوں، غلبہِ یاس و ہراس
تا بہ کجا ہوں دراز، سلسلہ ہائے فریب
پردہٴ اصلاح میں، کوششِ تخریب کا
حُبِ وطنِ مستِ خواب، دیکھیے کب تک رہے
قبضہٴ حزم و حجاب، دیکھیے کب تک رہے
ضبط کی لوگوں میں تاب، دیکھیے کب تک رہے
خلقِ خدا پر عذاب، دیکھیے کب تک رہے

حسرتِ آزاد پر، جو غلامانِ وقت
از روِ بغض و عتاب، دیکھیے کب تک رہے

- 1 مختصر جواب دیں:
 - i دونوں غزلوں میں ردیف کی نشان دہی کریں۔
 - ii دونوں غزلوں میں کون کون سے قافیے استعمال ہوئے ہیں؟
 - iii پہلی غزل کا مطلع لکھیں۔
- 2 درج ذیل اشعار میں اصطلاحی مفہوم کو مد نظر رکھتے ہوئے درست اصطلاح پر (✓) کا نشان لگائیں:
 - i بھلاتا لاکھ ہوں لیکن برابر یاد آتے ہیں
الہی ترک اُلفت پر وہ کیوں کر یاد آتے ہیں
 - ii (ب) مطلع (ج) مقطع (د) مطلع ثانی
”رسم جفا کا میاب دیکھیے کب تک رہے“ میں ”دیکھیے کب تک رہے“ ہے۔
 - iii (ب) مقطع (ج) قافیہ (د) ردیف
”حسرت آزاد پر جو رنلا مان وقت“ میں ”حسرت“ کیا ہے؟
 - 4 (ب) ردیف (ج) تخلص (د) مقطع
مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔
 - 5 حب وطن، ترک الفت، غلبہ یاس و ہراس، تخریب
مندرجہ ذیل الفاظ کو اس طرح جملوں میں استعمال کریں کہ اُن کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:
 - 6 خواب، حجاب، خبر، جفا، حُب
مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کیجیے۔
- 6 حسرت موبانی کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں۔

(1)

نہ گنواؤ ناوک نیم کش ، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
مرے چارہ گر کو نوید ہو ، صف دشمنان کو خبر کرو
جو بچے ہیں سنگ ، سمیٹ لو ، تن داغ داغ لٹا دیا
وہ جو قرض رکھتے تھے جاں پر ، وہ حساب آج چکا دیا
کہ غرور عشق کا بانگین ، پس مرگ ہم نے بھلا دیا
جو کہا تو سن کے اڑا دیا ، جو لکھا تو پڑھ کے مٹا دیا
جوز کے تو کوہ گراں تھے ہم ، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رو یار ہم نے قدم قدم ، تجھے یادگار بنا دیا

(2)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں ، کب بات میں تیرا بات نہیں
مشکل ہیں اگر حالات وہاں ، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا ، وہ شان سلامت رہتی ہے
میدان وفادر بازنہیں ، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں
دل والو کوچہ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں
یہ جان تو آنی جانی ہے ، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں
عاشق تو کسی کا نام نہیں ، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا ، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

مشق

1- درست جواب کے شروع میں (✓) کا نشان لگائیں۔

i- غزل نمبر 1 میں ردیف ہے۔

ا۔ دیا ب۔ گنوا ج۔ گنوا دیا د۔ گنوا، گنوا

ii- فیض احمد فیض کی وجہ شہرت ہے؟

ا۔ تنقید ب۔ مضمون نگاری ج۔ شاعری د۔ افسانہ نگاری

2- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کی وضاحت کریں۔

نادک نیم کش، چارہ گر، غرور عشق کا بانگین، کوہ گراں، مقتل۔

3- قافیہ اور ردیف کی تعریف لکھیں اور فیض احمد فیض کی غزلوں سے ایک ایک مثال لکھیں۔

4- مطلع اور مقطع کا فرق واضح کریں اور مثال بھی دیں۔

5- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

کرو کج جبین پہ سیر کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو

کہ غرور عشق کا بانگین پس مرگ ہم نے بھلا دیا

جوڑ کے تو کوہ گراں تھے ہم جو چلے تو جاں سے گزر گئے

رہ یار ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے

یہ جان تو آتی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

6- فیض احمد فیض کے کلام کا مطالعہ کریں اور دوائے اشعار لکھیں جن میں تلمیح یا تشبیہ موجود ہو۔

(1)

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا ، مرا تنہا ہونا
ایک نعمت بھی یہی ، ایک قیامت بھی یہی
جو برائی تھی مرے نام سے منسوب ہوئی
قعر دریا میں بھی آنکھ لگے گی ، سورج کی کرن
آتش و آب کا ممکن نہیں ، یک جا ہونا
روح کا جاگنا اور آنکھ کا ، بیٹا ہونا
دوستو! کتنا بُرا تھا مرا اچھا ہونا
مجھ کو آتا نہیں محروم ہونا

شاعری روزِ ازل سے ہوئی تخلیق ، ندیم
شعر سے کم نہیں ، انسان کا پیدا ہونا

(2)

اب تو کچھ اور ہی ، اعجاز دکھایا جائے
نئے انساں سے تعارف جو ہوا ، تو بولا
موت سے کس کو مفر ہے ، مگر انسانوں کو
شام کے بعد بھی سورج ، نہ بجھایا جائے
میں ہوں سقراط ، مجھے زہر پلایا جائے
پہلے جینے کا سلیقہ ، تو سکھایا جائے

علم ہے سچ بھی قرینے سے کہا جائے ، ندیم
زخم کو زخم نہیں ، پھول بتایا جائے

- 1- نیچے دیے گئے مصرعوں کو صحیح لفظ لگا کر مکمل کریں۔
 - i- کچھ غلط بھی تو نہیں تھا میرا..... ہونا (تنہا- پیدا)
 - ii- مجھ کو آتا نہیں محروم..... ہونا (تماشا- تمنا)
 - iii- قعر دریا میں بھی آنکھ لگی..... کی کرن (سورج- تارے)
 - iv- شاعری روز ازل سے ہوئی..... ندیم (تعبیر- تخلیق)
- 2- کالم الف اور کالم ب میں مطابقت قائم کیجیے اور جواب الگ کر کے لکھیں۔

کالم (الف)	کالم (ب)
i- شاعری روز ازل سے ہوئی تخلیق ندیم	مطلع
ii- شاعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا	رویف
iii- کچھ غلط بھی تو نہیں تھا میرا تنہا ہونا	مقطع
iv- آتش و آب کا ممکن نہیں کیجا ہونا	قافیہ
- 3- درج ذیل اشعار میں سے قافیہ اور رویف کی نشان دہی کریں۔

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
 شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے
 موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
 پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے
- 4- دوسری غزل میں "سقراط" اصطلاحاً استعمال ہوا ہے۔ اس اصطلاح کا نام لکھیں اور اس کی وضاحت کریں۔
- 5- دونوں غزلوں کے مقطع کی نشان دہی کریں۔
- 6- مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں۔

ایک نعمت بھی یہی ، ایک قیامت بھی یہی
 روح کا جاگنا اور آنکھ کا پینا ہونا
 موت سے کس کو مفر ہے مگر انسانوں کو
 پہلے جینے کا سلیقہ تو سکھایا جائے
- 7- مندرجہ ذیل الفاظ و تراکیب کا مفہوم بیان کریں۔

قعر دریا، قیامت، ازل، اعجاز، آتش و آب

فرہنگ

نوٹ: الفاظ کے معانی بالعموم وہی دیے گئے ہیں جو اسباق کے متن سے مطابقت رکھتے ہیں

اسوۂ حسنہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	حد سے متجاوز ہونا	حد سے بڑھ جانا	سیر چشمی	قناعت، فیاضی، بے پروائی
عالم گیر	دُنیا میں پھیلا ہوا	غائر نظر	گہری نظر	
جوہر	بخش، فیاضی	کتاب دانی	کتاب کو سمجھنا	فراخ حوصلگی
مسکنت	مسکینی۔ عاجزی	ہم سر	برابر کے	پس و پیش کرنا
سیرت	طرز زندگی	استعداد	قابلیت	ابوالقاسم زہراوی
رقیق القسی	نرم دلی	قوی	قوتیں	آسمان سے باتیں کرتی
اپنی مدد آپ	جوہر	عقل کی تیزی۔ ذہانت۔		ہوئی، اونچی
آزمودہ	تجربہ شدہ، آزمایا ہوا	لیاقت		سرجن
پنسال	سبیل، پانی کی گہرائی معلوم کرنے کا آلہ	ہم چشم	ہم مرتبہ، برابر والے	جلیل القدر
حاشا وکلا	ہرگز نہیں	محبت شاقہ	سخت محنت	عام فہم
نفس کشی	پرہیز گاری	مغائرت	اجنبیت	موفقہ فیاں
نظیر	ضمنہ، مثال	تا بمقدور	جہاں تک ممکن ہو، جہاں	دست گاہ
سر سید کے اخلاق و خصائل		تک اپنے بس میں ہو	مہارت تامہ	مکمل رسائی
بقاش	خوش	تسخیر کر لینا	رام کر لینا	ادیب کی عزت
تعدد	تعداد کے اعتبار سے زیادہ،	شاق گزرنے	ناگوار معلوم ہونا، برا لگنا	بساطی
	کسی چیز کے ہونے کی	راست بازی	سچائی	والا
	تعداد	وابستگی	تعلق، محبت	آہنی خود
تلون	مختلف حالتوں میں ہونا،	موانست	انس، محبت	لوہے کی ٹوپی جو جنگ میں
	مراد ہے کہ رنگارنگی مختلف	جہلی مہر و محبت	فطری محبت	سر کی حفاظت کے لیے
	اقسام کا ہونا	سفر و حضر میں	سفر اور قیام میں، سفر کی	استعمال ہوتی ہے
فواکہ	پھل	حالت میں بھی اور قیام کی		اوور کوٹ
تصنع	بناوٹ	حالت میں بھی		عمدہ لباس پہنے ہوئے
				خراماں خراماں

مکتوبات اقبال

حرکات و سکنا	اٹھنا بیٹھنا، ہلنا جلنا	تقصیر	غلطی	مکتوبات اقبال
متانت	بچیدگی	سرگزشت	حال، احوال	آرام
استقامت	توفیق	ذکر العیش	عیش کا ذکر، عیش و آرام کا	رفتی
قماش	ڈھنگ، طرز، وضع	تذکرہ	مصر ہونا	اصرار کرنا، ضد کرنا،
شانِ استغنا	بے نیازی، بے پروائی	نصف العیش	آدھا عیش، آدھے عیش	بار بار تقاضا کرنا
پُر اسرار	بھیدوں سے بھرا ہوا، جس	قناعت کرنا	جو میسر آ جائے اسی پر	دکھ، تکلیفیں
ممودار ہونا	اچانک ظاہر ہونا	میعاد	مدت	گرامی نامہ، خط
منعطف کرنا	مبذول کرنا	ہنوز	ابھی تک	ادب
بوسیدہ	گلاسٹرا، بہت پرانا	کابلی	سستی	لاہور کا جغرافیہ
خجل	شرم سار، نادم	الملك لله والحمد لله	سلطنت اور حکومت اللہ کے	آغاز، ابتدا، مقدمہ
سفرارش	ذرا سی جان، تھوڑی سی چیز	نجات	لے ہے	دلیل کی جمع،
رق	شرمندگی	اصلاح	رہائی	کمزور، ضعیف، ست
ندامت	احسان مندی	فراہم ہونا	درستی	دور کرنا
ممنونیت	مان جانا	توشے خانے میں	اکٹھا ہونا، ملنا	جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے
اعتراف کرنا	چراغ کی کو	سٹور بھی مراد لیا جاسکتا ہے	کا لباس رکھنے کا کمرہ،	جس کا ذکر بعد میں ہوا ہے
آگن	صحن	خیریت	اہل سیف	تلوار والے یعنی جنگ
جی اللنا	گھبراہٹ ہونا	عافیت	پدر طولی رکھنا	کرنے والے
جھومجھ ایسے بال	بے حد لٹے بال	فصد ہونا	حدود اور بعد	پوری مہارت رکھنا
کا کھنا	کراہنا	مسہل	رگ سے خون اگلوانا	چاروں طرفیں،
مکتوبات غالب	مکتوبات غالب	نا تو ازل	قبض دور کرنے والی دوا	چاروں طرفوں کے علاقوں
املاک	ملک کی جمع، جائداد	صاحب فراش	کمزور، ضعیف	کی تفصیل
پیش	پیش	بیمار، علیل	عارضہ	بیماری
		بحث و تھیں	بحث و تھیں	بحث مباحثہ

مقادیر عامہ	عام لوگوں کی بہتری، عوام	نادیدہ	نہ دیکھا ہوا، آن دیکھا	ماحصل	خلاصہ، لب لباب
بہم رسانی آب	پانی پہنچانا، پانی مہیا کرنا	اوندھا	آلنا	مرغ بانی	مرغیاں پالنا
تحقیق و تدقیق	کھوج اور غور و فکر	دانشمند	عقل مند	قنوطی	زندگی کا تاریک پہلو دیکھنے
رائے دہندگی	رائے دینا	پیر تسمہ پا	پہنچا نہ چھوڑنے والا		والا، مایوس، ہر طرح سے
کماحقہ	جیسا کہ حق ہے، جیسا کہ	دم تحریر	لکھتے وقت، جب یہ		ناامید
دہانت	ہونا چاہیے	تھرل	اگر بڑی لفظ Thrill ہے،	قنوطیت	زندگی کا تاریک پہلو ہی
مژدہ	خوش خبری	تائید	جوش و جذبہ	ناحق	بلاوجہ
عقبی دیوار	پچھلی دیوار	نشنا	شاگردی	سادہ لوحی	سادگی
مطیع نظر	اصل مقصد	خریطہ	جھگڑا، فساد	آسن	گھوڑے پر بیٹھنے کا طریقہ
دساور	غیر ممالک، غیر ملک کی		تھیل، وہ تھیلی جس میں	مہادت	فیل ہان
مصاحب	منڈی	بے غل و غش	سرکاری حکم جاتا ہے	داشت	دیکھ بھال
جو دو سٹا	ساتھی	پناہ	پرورش، دست گیری	پرداخت	فطری
فروش ہونا	سیاحت، فیاضی	امان	محنت و تکلیف کے بغیر	جہتی	صبح سویرے نیند سے جاگ
آواگون	قیام کرنا، رہائش پذیر ہونا،	اجمال	سحر خیزی	درشتی سے	جانا
	نظر ہونا	اور آنا گھر میں مرغیوں کا	انتصار، مختصر سا ذکر	درشتی سے	تختی سے سخت لہجے میں
	یون بدلنا، مرنے کے بعد	راخ عقیدہ	پنہ عقیدہ، پکا یقین	ورود و نزول	وارد ہونا، پہنچنا۔ آمد
	روح کا کسی دوسرے جسم	ایشار	قربانی	ناقابل تردید	جسے رو نہ کیا جاسکے
	میں آ جانا	پھوہڑ	جسے کوئی تیز نہ ہو، بے سلیقہ	ازراہ تلمط	مہربانی کر کے
خرفے	بکھیرے، جھگڑے،	مفقود ہونا	ہالک نہ ہونا	آلام دینیوی	دنیا کے دکھ، دنیا کی تکالیف
	پریشانیاں	نیم برشت	آدھا تلا ہوا، پوری		حمد
	کیا واقعی دنیا گول ہے		طرح نہ تلا ہوا،	خلوت	تنہائی
دھرتی	زمین	(Half Boiled)	جلوت	جلوت	خلوت کا متضاد، تنہائی نہ
دھرتی کا گز بننا	بہت زیادہ سفر میں رہنا	رد و قدح	بحث مباحثہ، بگڑا		ہونا، سر عام ہونا

مستقبل کی جھلک

پنہاں	چھپا ہوا، پوشیدہ	میبو	تیز کی قسم کا ایک	مستقبل کی جھلک
عیان	ظاہر		چھوٹا سا پرندہ	کواکب کی جمع، ستارے
محرم راز	راز سے واقف	طاؤس	مور	بدلے میں، کی بجائے
راز داں	راز جاننے والا	دراج	تیز	ستارے
	نعت	کبک	چکور	زیادہ چمکنے والے، زیادہ
گریزاں	گریز کرنے والا،	مرغان خوش نوا	اچھی آواز والے پرندے،	روشن
	دور رہنے والا		اچھی آواز میں چھپانے	سنجیدہ دین، مضبوط دین،
صدافت	سچائی		والے پرندے	مراد ہے "اسلام"
انگٹوں	آنسوؤں	تھالے	درختوں کے گرد پانی دینے	نوا پادیاں قائم کرنا، ہوس
دہر	زمانہ، دنیا		کے لیے بنائے ہوئے کم	گیری کے جذبے سے
مرقت	رواداری، لحاظ		گہرائی کے گڑھے	دوسرے آزاد ممالک کو
وابستہ داماں	دامن سے وابستہ، دامن	فحل	درخت	غلام بنانا
	تھامے ہوئے	سہد	ٹوکری، ٹوکرا	جنگ کا گھر، دارالحرب اس
	تسلیم و رضا		گہرے آب دار	ملک کو کہتے جہاں کافروں
فقر	درویشی		بالائے فحل	کی حکومت ہو مسلمانوں کو
افلاس	غربت، غریبی		خواہاں	مذہبی فرائض کی ادائیگی
ادبار	بد نصیبی، فحشت، مفلسی		چاہنے والے	سے روکا جا رہا ہو اور اس
جنجال	مصیبت، آفت			بنا پر دہاں جہاد کا حکم ہو،
عالم	کیفیت	حق سبز	اس کا راز سچ ہے، اللہ	شاعر نے آزادی کے قبل
حرم	خوش		تعالیٰ کی ذات حق ہے، یہ	کے ہندوستان کو دارالحرب
	میدان کر بلا میں صبح کا منظر		عارفوں اور درویشوں کا	کہا ہے
زندگاری	سبز		نعرہ ہے	امن و امان کی جگہ
گوہر یکتا	بے مثال جواہر	علی العموم	عموماً	دیوانگی، جوش و جذبہ
جواہر نگار	موتیوں کی طرح خوب	رب علی	اللہ تعالیٰ	خوش خبری
	صورت	مدح	تعریف، حمد	

نیل فام	برسات	منعم	امیر آدمی	ایپسٹریکٹ آرٹ
خنداں	منکرانا ہوا، کھلا ہوا	آبا	بڑھ کر	محض لحاظ ہی لحاظ میں
ہلال استیقلال	نہت	تعلق	بپ دادا	تعریف
استحکام	مضبوطی، پائیداری	گفتار	بولنا، مراد ہے "باتیں ہی	اطفال
انگشت	انگلی	عمل	باتیں"	مقلد
پرتو	عکس	کردار	فرمان	سوچ بچار کرنے والا
نوید	خوش خبری	ثابت	شرع	حکم
علم	جھنڈا	سیارا	ایک ہی مقام پر رکا ہوا	قرآن وحدیث، اسلامی
سحاب خود	سحابت کا بادل، بہت	اسلاف	محرک	قانون
خطاب بہ جوانان اسلام	زیادہ سخاوت	آئین مسلم	بپ دادا، پچھلے بزرگ	لوکل بس
تدبر کرنا	غور کرنا، سوچنا	اصول	مانا ہوا اصول طے شدہ	پکڑا ہوا پرندہ
گردوں	آسمان	پیغام	گل بدن	پھولوں کے سے بدن والا،
آغوش	گود	واقف	نازک بدن	وحدانیت
تہن آفریں	تہن پیدا کرنے والا یعنی	بارش	واحد ہونا، ایک ہونا،	وحدانیت
	دنیا کو تہذیب سے	راہی، مسافر	مراد ہے "اللہ تعالیٰ کا واحد	
	آشنا کرنے والا	ڈر، خوف	اور لا شریک ہونا"	
خلاق	پیدا کرنے والا، بنانے والا	کشتی کھینے والا، ملّا ح	اور لا شریک ہونا"	یکتا
جہاں داری	حکمرانی، حکومت کرنا	کجاوہ، ایک خاص قسم کی	اکیلا، بے نظیر	سقوط
شتر بان	اونٹ پالنے والے، اونٹ	ذولی جو سواری کے لیے	شان وشوکت	ستار
	چرانے والے، عرب لوگ	اونٹ پر باندھتے ہیں	پردہ پوشی کرنے والا	ساعت
	مراد ہیں	جھوٹ	گھڑی	عصیاں
امارت	امیری	کوزا کرکٹ	گنگناہ	غزل - میر
گدائی	فقیری، بے سروسامانی	اللہ تعالیٰ کے سوا یعنی اللہ	بند ہو جانا	مند جانا
		تعالیٰ کے سوا جو کچھ بھی ہے	کھلنا	واہونا

شعار	طریقہ، چلن	غزل - مومن	چارہ گر	معالج
شش جہت	مجھے طرفین، مراد ہے	راحت فزا	پس مرگ	موت کے بعد
	ساری دنیا۔ مجھے طرفین	راحت کا سبب بننے والا	گلشنی	مارے جانے کے قابل
	اس طرح بنتی ہیں: دائیں،	مضطرب	گفتنی	بات جو کہنے کے قابل ہو
	بائیں، آگے، پیچھے، اوپر، نیچے	غزل - مومن	غزل - فیض	
دو چار ہونا	ملاقات ہونا، آنا سامنا	ناچار	مقتل	قربان گاہ
	ہونا	فصل گل	بہار کا موسم	جدائی
غزل - آتش	گل کھلنا	کوئی بالکل نئی بات ہو جانا	غزل	- احمد ندیم قاسمی
عدم	نہ ہونا، مراد ہے "دوسری	سوئے دشت	آتش و آب	آگ اور پانی
	دنیا جہاں مرنے کے بعد	رہا	پینا	دیکھنے والا
	جانا ہے"	بدعت کرنے والا، دین	قعر دریا	دریا کی گہرائی
کوچ	سفر، روانگی	میں کوئی نئی بات نکالنے	روز ازل سے	اول روز سے، ابتدائی
ہستی	ہونا، مراد ہے "زندگی"	والا، فساد، ظالم	غزل	- احمد ندیم قاسمی
بدرق	رہبر، رہنما	غزل - حسرت	غزل	- احمد ندیم قاسمی
عناایت پروردگار	اللہ تعالیٰ کی مہربانی	ہم نشیں	دوست	مہجرہ
غزل - آتش	غزل - آتش	ترک الفت	محبت کو ختم کرنا	مفر
خوب ہوا	اچھا ہی ہوا	حقیقت کھل گئی	اصلیت سامنے آگئی	جائے فرار، چارہ کار
عالم	کیفیت	غزل - حسرت	غزل - حسرت	
برگشتہ طالعی	بد نصیبی	یاس و ہراس	ناامیدی اور ڈر	
"غزل - داغ"	غزل - داغ	حزم	احتیاط، دوراندیشی	
اجل	موت	ضبط	برداشت	
نہیں کھیل	کوئی کھیل نہیں، کوئی	بہر	ظلم، ستم، سختی	
	آسان کام نہیں	انحصار	کینہ، حسد، دشمنی	
خاطر	لحاظ، پاسداری	غزل - فیض	غزل - فیض	
تاب و توان	طاقت، حوصلہ، صبر و تحمل	ناوک نیم کش	ادھ کھینچا تیر	